اپریل ۲۰۱۰ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ڈاکٹر رفیع الدین فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام

ماہر فلسفی و معروف سکالر ڈاکٹر محمد رفیع الدین (مرحوم) کی معرکۃ الآراء کتاب

IDEOLOGY OF THE FUTURE

کا چوتھا ایڈیشن 1970ء کے بعد اب شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا ہے

یہ کتاب انسانی جبلت اور انسانی عمل کے طبعی قوانین اور طریقہ کار کے مطالعہ پر مشتمل ہے جو تاریخ کے دھارے یا نظریاتی ارتقاء کے عمل کو متعین کرتا ہے۔ نیز یہ کتاب کارل مارکس، فرائڈ، ایڈلر اور میکڈوگل کے نظریات کے علمی مناقشے اور نقد پر بھی مشتمل ہے۔

☆ **406** صفحات مع انڈیکس ☆ قیمت: **750** روپے

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی کتاب ''قرآن اور علم جدید'' کا انگریزی زبان میں ترجمہ

The Quran and Modern Knowledge

پہلی مرتبہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہو گیا ہے

اس کتاب میں قرآن کے فلسفہ و حکمت کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ رائج الوقت افکار و نظریات پر محکم دلائل کی بنیاد پر نقد بھی کی گئی ہے

☆ **466** صفحات ☆ قیمت: **550** روپے

دونوں کتابیں عمدہ طباعت، اعلیٰ جلد بندی اور خوبصورت ٹائٹل کور سے مزین ہیں

ہول سیلرز، پبلشرز اور بک سیلرز کے لیے خصوصی رعایتی قیمت

ملنے کا پتہ: ڈاکٹر رفیع الدین فاؤنڈیشن

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور فون: **042-35074598**

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد : 59

شمارہ : 4

ربیع الثانی 1431ھ

اپریل 2010ء

فی شمارہ -/25

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مجلس ادارت

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

اندرون ملک	250 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36271241

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 3

پاک امریکہ اسٹریٹیجک مذاکرات — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن — 5

سورۃ النساء (آیات ۱۴۲ تا ۱۷۶) — ڈاکٹر اسرار احمد

اسلام کا نظامِ حیات — 31

اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام — ڈاکٹر اسرار احمد

منہجِ انقلابِ نبویؐ — 49

قتال فی سبیل اللہ: سیرت کے آئینہ میں — انجینئر نوید احمد

تذکیر و موعظت — 61

اسلام۔ دینِ رحمت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

شہادتِ حق — 68

اُمّتِ مُسلمہ۔ اُمتِ وسط — عتیق الرحمٰن صدیقی

کردار کے غازی — 77

اساطینِ علم کے اربابِ اقتدار سے تعلقات (۳) — طاہر اسلام عسکری

دعوتِ فکر — 85

جدید مساوات یا عدلِ اسلامی — محمد عمران صدیقی

خطوط و نکات — 94

خصوصی اشاعت پر تہنیتی مکاتیب

❁ ❁ ❁

عرضِ احوال

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

پاک امریکہ اسٹریٹیجک مذاکرات

مارچ کے آغاز سے ہی ہمارا پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پاک امریکہ اسٹریٹیجک مذاکرات کے حوالہ سے گونج رہا ہے' اسی کی صدا کانوں میں رس گھول رہی ہے اور یہی خبر پڑھنے کو مل رہی ہے۔ مہنگائی سے ڈسے ہوئے اور گرمی سے ستائے ہوئے لوڈشیڈنگ کے عذاب میں مبتلا عوام مذاکرات کو تو اپنے لئے ''مذاق رات'' ہی سمجھتے ہیں اور اپنے ۶۳ سالہ تجربہ کی بنیاد پر کچھ غلط نہیں سمجھتے' البتہ اسٹریٹیجک کے لاحقہ نے انہیں مزید پریشان کردیا ہے کہ یہ کس بلا کا نام ہے! ''سانپ کا ڈسا رسّی سے ڈرتا ہے'' اور ''دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے'' کے مصداق عوام خوفزدہ ہیں کہ کہیں کوئی نئی مصیبت اُن کے پیارے گھر پاکستان کا رخ کرنے والی ہے؟ ترقی یافتہ ممالک کے عوام جاہل نہیں ہوتے' البتہ بے شعور ہو سکتے ہیں۔ پاکستان جیسے انتہائی پسماندہ ملک کے عوام اَن پڑھ بھی ہیں اور بے شعور بھی۔ پھر یہ کہ جمہوریت کبھی یہاں قدم نہیں جما سکی کہ عوام کو اہمیت دینے کی ضرورت محسوس کی گئی ہو۔ گویا دنیا کے نکتہ نظر سے یہاں مکمل تاریکی ہے اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ لیکن جس طرح کسی شخص کے حواسِ خمسہ میں سے ایک چیز کی محرومی دوسری کی بہتری کا باعث بنتی ہے اسی طرح عوام کی چھٹی حس خواص سے زیادہ تیز اور زیادہ بیدار ہوتی ہے اور پھر یہ کہ وہ اپنے تجربہ پر بہت زیادہ انحصار اور بہت اعتماد کرتے ہیں۔ ۶۳ سال میں مذاکرات نے پاکستان کو دیا کچھ نہیں' البتہ پاکستان نے کھویا بہت کچھ ہے۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۵ء میں ہم نے میدانوں میں جیتی ہوئی جنگ مذاکرات ہی میں ہاری۔

آیئے پہلے ہم اسٹریٹیجک کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب یہ لفظ مذاکرات کا حصہ بنے گا تو اس کا مطلب ہے ایسی دوطرفہ گفتگو جس میں اندازِ جنگ' عسکریت اور فنِ حرب پر بات ہوگی' ایسی گفتگو جس میں جنگی معاملات پر منصوبہ بندی اور حکمت عملی پر تبادلہ خیال ہوگا۔ اسٹریٹیجک مذاکرات کا معنی یہ بھی لیا جاسکتا ہے کہ کسی جنگ یا جنگی مہم جوئی کے حوالہ سے باہمی دانش کو مجتمع کیا جائے' یعنی یہ جنگی حکمت عملی اور منصوبہ بندی کی شیئرنگ ہے۔ اب یہ امریکی کمالات میں سے ایک کمال ہے اور اس کی سُپرمیسی کا ایک ثبوت ہے کہ یہ گندی جنگ جسے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا نام دیا گیا ہے اسے پاکستان کی جنگ بنا دیا گیا ہے۔ اگر اس امریکی الزام کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم بھی کرلیا جائے کہ افغانستان میں مقیم اسامہ بن لادن نائن الیون کے واقعہ کا ذمہ دار ہے اور امریکہ نے جوابی حملہ میں افغانستان کو تہس نہس کیا ہے تب بھی اس موقف کا کیا جواز ہے کہ جو ہمارے ساتھ نہیں وہ دہشت گردوں کا ساتھی ہے اور ہماری اُس کے ساتھ جنگ ہوگی۔ پاکستان کا ناعاقبت اندیش حکمران خوف اور لالچ کی بنیاد پر اس جنگ میں شریک ہوگیا۔ وہ حکمران چلتا بنا لیکن اُس کی بنائی ہوئی پالیسی ابھی تک پاکستان میں چل رہی ہے' بلکہ موجودہ حکمرانوں کی نااہلی اور غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امریکہ اس جنگ کو پاکستان کی طرف منتقل کرچکا ہے۔ لہٰذا طالبانِ افغانستان کو مشترکہ دشمن قرار دے کر پاکستان اور امریکہ اسٹریٹیجک مذاکرات کررہے ہیں۔ حکمرانوں کے علاوہ ہمارے ملک کا سیکولر دانشور طبقہ'

جسے اسلام اور طالبان سے خدا واسطے کا بیر ہے' بڑھ چڑھ کر اسے پاکستان کی جنگ قرار دے رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ پاکستان کی جنگ ہے تو ہمیں کیا حق حاصل ہے کہ ہم امریکہ کو جنگی کارکردگی کے بل ارسال کر کے اس سے ڈالر وصول کریں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک صلیبی جنگ ہے جو عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان لڑی جا رہی ہے۔ صلیبی جنگیں ماضی میں بھی مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین لڑی گئیں۔ قطع نظر اس سے کہ ان جنگوں میں کس کی فتح اور کس کو شکست ہوئی' دونوں متحارب قوتوں کے درمیان صف بندی بالکل واضح ہوئی' ایک طرف عیسائی اور دوسری طرف مسلمان ہوتے تھے۔ اس صلیبی جنگ میں ایک طرف مسلمان مجاہدین ہیں اور دوسری طرف عیسائی قوتیں' جبکہ مسلمان حکمران بدقسمتی سے عیسائی قوتوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔

اس صورت حال میں اور اس پس منظر میں پاک امریکہ اسٹریٹیجک مذاکرات کا نتیجہ کیا ہوگا اور ہمارے حوالے سے کسے کامیابی قرار دیا جائے گا؟ وہ کامیابی یہ ہوگی کہ ہم پرانی تنخواہ پر کام کرنے سے انکار کر دیں گے اور طالبانِ افغانستان کو مارنے' بھگانے اور پکڑوانے پر امریکہ ہمیں مزید انعامات سے نوازے گا' مراعات دے گا اور بھارت کے حوالے سے کچھ رعایتیں دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ ع قوے فروختند و چہ ارزاں فروختند! گویا سوال یہ نہیں ہے کہ دیکھا جائے کہ ظالم اور غاصب کون ہے' حق پر کون ہے اور ناحق پر اصرار کسے ہے۔ یعنی حق و باطل کا میزان نہیں لگایا جا رہا' عدل اور ظلم کا تقابل نہیں کیا جا رہا' سچ اور جھوٹ کو نہیں پرکھا جا رہا' بلکہ مذاکرات اس نکتہ پر ہو رہے ہیں کہ ظلم' جبر اور جھوٹ کا ساتھ دینے کے لیے اتنا نہیں اتنا لیں گے۔ کم لینا حکومت پاکستان کی ناکامی اور زیادہ لینا کامیابی ٹھہرے گی۔

امریکہ اپنے مقاصد کے حوالے سے واضح ہے۔ اُسے سرمایہ دارانہ نظام کا تحفظ کرنا ہے' اسے گریٹر اسرائیل کے قیام میں یہودیوں کی مدد کرنا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ متبادل اسلامی نظام جو سرمایہ پرست نظام کی جڑوں پر کلہاڑا بن کر گر سکتا ہے اُس نظام کو دنیا میں کہیں قائم نہیں ہونے دینا۔ اگر طالبان افغانستان میں واپس آ گئے تو وہ ایسے عادلانہ اور مثالی نظام کی نظیر قائم کر سکتے ہیں کہ دنیا اُس کو اپنانے کے لئے آگے بڑھے اور یہودیوں کے قائم کردہ اُس ظالمانہ نظام سے دنیا کو نجات ملے جس سے انہوں نے ساری دنیا کو معاشی طور پر جکڑا ہوا ہے۔ امریکہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ اس جنگ کی آڑ میں پاکستان کو غیر مستحکم اور انتشار کا شکار کر کے اُسے ایٹمی اسلحہ سے محروم کر دیا جائے' کیونکہ گریٹر اسرائیل کے قیام تک پاکستان میں مخلص مسلمانوں کی حکومت وجود میں آ گئی تو اسرائیل کی سلامتی کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

ہم اپنے حکمرانوں سے سوال کرتے ہیں کہ وہ امریکہ سے ڈالر کس خدمت گزاری پر وصول کرنا چاہتے ہیں؟ طالبانِ افغانستان کے خون کی قیمت' نظام اسلام سے بچنے کی قیمت اور گریٹر اسرائیل کے قیام میں مدد کی قیمت؟ ہم حکمرانوں کی خدمت میں عرض کیے دیتے ہیں کہ وہ کسی سودا بازی سے پہلے تاریخ کا مطالعہ کر لیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ وفاداریاں خریدنے والوں نے بعد ازاں فروخت کنندگان کو عبرت ناک انجام سے دوچار کیا۔ ملت کے غدار کوئی دنیاوی فائدہ حاصل کیے بغیر جہنم واصل ہو گئے۔ ہم اپنی سیاسی قیادت سے تو کوئی توقع نہیں رکھتے' البتہ عسکری قیادت سے ہمیں کچھ توقعات ہیں کہ وہ مجموعی صورت حال کا جائزہ لے کر اپنی سابقہ پالیسی کو نہ صرف جاری رکھیں گے بلکہ اللہ پر بھروسہ کر کے امریکہ کو صاف صاف کہہ دیں گے کہ افغانستان سے اپنا بستر گول کرے اور افغانیوں کو افغانستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے دے۔ oo

دورۂ ترجمۂ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ النِّساء

آیات ۱۴۲ تا ۱۵۲

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا
كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ
ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ
سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ
فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا
وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ
وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ
شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْۗءِ
مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ
تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْۗءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ
بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ
بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰۗىِٕكَ
هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰۗىِٕكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ ع ۲۱ ۱۱ ۱

آیت ۱۴۲ ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ ''یقیناً منافق کوشش کر رہے ہیں اللہ کو دھوکہ دینے کی''

یہ مضمون سورۃ البقرہ کے دوسرے رکوع میں بھی آ چکا ہے۔ مُخادَعة بابِ مفاعلہ کا مصدر ہے۔ اس باب میں کسی کے مقابلے میں کوشش کے معنی شامل ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں دو فریقوں میں مقابلہ ہوتا ہے اور پتا نہیں ہوتا کہ کون جیتے گا اور کون ہارے گا۔ لہٰذا اس کا صحیح ترجمہ ہوگا کہ ''وہ دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں''۔ اس کے جواب میں اللہ کی طرف سے فرمایا گیا:

﴿وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ﴾ ''اور وہ ان کو دھوکہ دے کر رہے گا۔''

خَادِع ثلاثی مجرد سے اسمِ فاعل ہے اور یہ نہایت زوردار تاکید کے لیے آتا ہے' اس لیے ترجمہ میں تاکیدی الفاظ آئیں گے۔ یہاں منافقین کے لیے دھوکہ والا پہلو یہ ہے کہ اللہ نے ان کو جو ڈھیل دی ہوئی ہے اس سے وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم کامیاب ہو رہے ہیں' ہمارے اوپر ابھی تک کوئی آنچ نہیں آئی' کوئی پکڑ نہیں ہوئی' کوئی گرفت نہیں ہوئی' ہم دونوں طرف سے بچے ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے وہ اپنی اس ڈھیل کی وجہ سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور درحقیقت یہی دھوکہ ہے جو اللہ کی طرف سے ان کو دیا جا رہا ہے۔ یعنی اللہ نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

﴿وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ﴾ ''اور جب وہ کھڑے ہوتے ہیں نماز کے لیے تو کھڑے ہوتے ہیں بڑی کسل مندی کے ساتھ''

یہ منافقین جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ طبیعت میں بشاشت نہیں ہے' آمادگی نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنا بھی ضروری ہے لہٰذا مجبوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قَامَ فعل ہے اور اس کے معنی ہیں کھڑے ہونا' جبکہ قَائِم اس سے اسم فاعل ہے۔ مختلف زبانوں میں عام طور پر verb کے بعد prepositions کی تبدیلی سے معنی اور مفہوم بدل جاتے ہیں۔ مثلاً انگریزی میں to give ایک خاص مصدر ہے۔ اگر to give up ہو تو معنی یکسر بدل جائیں گے۔ پھر اگر یہ to give in ہو تو بالکل ہی الٹی بات ہو جائے گی۔ اسی طرح عربی میں بھی حروفِ جار کے تبدیل ہونے سے معانی بدل جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر قَامَ عَلٰی ہو' جیسے ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ میں ہے تو اس کے معنی ہوں

حاکم ہونا' سربراہ ہونا' کسی کے حکم کا نافذ ہونا۔ لیکن اگر قَامَ اِلٰی ہو (جیسے آیت زیرنظر میں) تو اس کا مطلب ہوگا کسی شے کے لیے کھڑے ہونا' کسی شے کی طرف کھڑے ہونا' کوئی کام کرنے کے لیے اٹھنا' کوئی کام کرنے کا ارادہ کرنا۔ اس سے پہلے ہم قَامَ 'بِ' کے ساتھ بھی پڑھ چکے ہیں: قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ اور قَائِمًا بِالْقِسْطِ۔ یہاں اس کے معنی ہیں کسی شے کو قائم کرنا۔ تو آپ نے ملاحظہ کیا کہ حروفِ جار (prepositions) کی تبدیلی سے کسی فعل کے اندر کس طرح اضافی معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔

﴿یُرَآءُوْنَ النَّاسَ﴾ ''محض لوگوں کو دکھانے کے لیے''

﴿وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۴۲﴾﴾ ''اور اللہ کا ذکر نہیں کرتے مگر بہت کم۔''

یعنی ذکرِ الٰہی جو نماز کا اصل مقصد ہے ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ﴿۱۴﴾﴾ (طٰہٰ) وہ انہیں نصیب نہیں ہوتا۔ مگر ممکن ہے اس بے دھیانی میں کسی وقت کوئی آیت بجلی کے کڑکے کی طرح کڑک کر ان کے شعور میں کچھ نہ کچھ اثرات پیدا کر دے۔

آیت ۱۴۳ ﴿مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ﴾ ''یہ اس کے مابین مذبذب (ہو کر رہ گئے) ہیں۔''

کفر اور ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں' کسی طرف بھی یکسو نہیں ہو رہے۔ اسی لیے قرآن میں حضرت ابرٰہیم علیہ السلام کے تذکرے کے ساتھ حَنِیف کا لفظ بار بار آتا ہے۔ دین کے بارے میں اللہ کی طرف سے ترغیب یہی ہے کہ یکسو ہو جاؤ۔ دنیا میں اگر انسان کفر پر بھی یکسو ہوگا تو کم از کم اس کی دنیا تو بن جائے گی' لیکن اگر دنیا اور آخرت دونوں بنانے ہیں تو پھر ایمان کے ساتھ یکسو ہونا ضروری ہے۔ لیکن جو لوگ بیچ میں رہیں گے' اِدھر کے نہ اُدھر کے' ان کے لیے تو ﴿خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ﴾ کے مصداق دنیا اور آخرت دونوں کا گھاٹا اور نقصان ہوگا۔

﴿لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ﴾ ''نہ تو یہ اِن کی جانب ہیں اور نہ ہی اُن کی جانب ہیں۔''

نہ اہلِ ایمان کے ساتھ مخلص ہیں اور نہ اہلِ کُفر کے ساتھ۔ نہ اِن کے ساتھ یکسُو ہیں اور نہ اُن کے ساتھ۔

﴿وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ سَبِیْلًا ﴿۱۴۳﴾﴾ ''اور جسے اللہ ہی نے گمراہ کر دیا ہو تو اس کے لیے تم کوئی راستہ نہ پاؤ گے۔''

یعنی جس کی گمراہی پر اللہ کی طرف سے مہرِ تصدیق ثبت ہو چکی ہو' اس کے راہِ راست پر

آنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

آیت ۱۴۴ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ط﴾ ''اے اہلِ ایمان! مت بناؤ کافروں کو اپنا دلی دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر۔''

یہ مضمون پہلے آیت ۱۳۹ میں بھی آ چکا ہے۔ یہ بھی نفاق کی ایک علامت ہے کہ اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کے ساتھ دوستیوں کی پینگیں بڑھائی جائیں' ان کو اپنا حمایتی' مددگار اور رازدار بنایا جائے۔

﴿اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ﴿۱۴۴﴾﴾ ''کیا تم چاہتے ہو کہ تم اپنے خلاف اللہ کے ہاتھ میں ایک صریح حجت دے دو؟''

اس طرح تم لوگ خود ہی اپنے خلاف ایک حجت فراہم کر رہے ہو۔ جب اللہ تعالیٰ آخرت میں تمہارا محاسبہ کرے گا' تب اس سوال کا کیا جواب دو گے کہ تمہاری دوستیاں کافروں کے ساتھ کیوں تھیں؟ اس طرح تمہارا یہ فعل تمہارے اپنے خلاف حجتِ قاطع بن جائے گا۔

اب جو آیت آ رہی ہے وہ ایک اعتبار سے منافقین کے حق میں قرآن حکیم کی سخت ترین آیت ہے۔ اگرچہ بعض دوسرے اعتبارات سے' بلکہ ایک خاص لطیف پہلو سے ایک آیت اس سے بھی سخت تر ہے جو سورۃ التوبہ میں آئے گی۔ دراصل طویل سورتوں میں سے سورۃ النساء اور سورۃ التوبہ دو ایسی سورتیں ہیں جن میں نفاق کا مضمون بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔

آیت ۱۴۵ ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ج وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا ﴿۱۴۵﴾﴾ ''یقیناً منافقین آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے' اور تم نہ پاؤ گے ان کے لیے کوئی مددگار۔''

اگلی آیت میں ان لوگوں کے لیے ایک رعایت کا اعلان ہے۔ منافقت کا پردہ کُلی طور پر تو سورۃ التوبہ میں چاک ہوگا۔ یعنی اُن کے لیے آخری احکام سن ۹ ہجری میں آئے تھے' جبکہ ابھی سن ۴ ہجری کے دَور کی باتیں ہو رہی ہیں۔ تو ابھی ان کے لیے رعایت رکھی گئی ہے کہ توبہ کا دروازہ ابھی کھلا ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۴۶ ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ﴾ ''سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کریں اور اصلاح کرلیں اور اللہ سے چمٹ جائیں''

اللہ کا دامن مضبوطی سے تھام لیں‘ ایمان کے ساتھ یکسو ہو جائیں۔ ’’کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ‘‘ کے مصداق اللہ والے بن جائیں۔ شیطان سے محبت کی پینگیں نہ بڑھائیں‘ شیطان کے ایجنٹوں سے دوستیاں نہ کریں‘ اور اپنے آپ کو دین اسلام کے ساتھ وابستہ کرلیں کہ ہر چہ بادا باد‘ اب تو ہم اسلام کی اس کشتی پر سوار ہو گئے ہیں‘ اگر یہ تیرتی ہے تو ہم تیریں گے‘ اور اگر خدانخواستہ اس کے مقدر میں کوئی حادثہ ہے تو ہم بھی اس حادثے میں شامل ہوں گے۔

﴿وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ﴾ ’’اور اپنی اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کرلیں‘‘

یہ نہ ہو کہ زندگی کے کچھ حصے میں اطاعت اللہ کی ہو رہی ہے‘ کچھ حصے میں کسی اور کی ہو رہی ہے کہ کیا کریں جی! یہ معاملہ تو رواج کا ہے‘ برادری کو چھوڑ تو نہیں سکتے نا! معلوم ہوا آپ نے اپنی اطاعت کے علیحدہ علیحدہ حصے کر لیے ہیں اور پھر ان میں انتخاب کرتے ہیں کہ یہ حصّہ تو برادری کی اطاعت میں جائے گا اور یہ حصہ اللہ کی اطاعت کے لیے ہوگا۔ اطاعت جب تک کل کی کل اللہ کے لیے نہ ہو‘ اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں ہے۔ سورۃ البقرۃ (آیت ۱۹۳) میں ہم نے پڑھا تھا: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ یہاں پر دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی سطح پر دین اللہ کے لیے ہو جائے‘ یعنی اسلامی ریاست قائم ہو جائے‘ پورا اسلامی نظام قائم ہو جائے‘ شریعتِ اسلامی کا نفاذ عمل میں آجائے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو کم از کم ایک شخص انفرادی سطح پر تو اپنی اطاعت اللہ کے لیے خالص کرلے۔ یہ گویا انفرادی توحیدِ عملی ہے۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝﴾

’’تو پھر یہ لوگ اہلِ ایمان میں شامل ہو جائیں گے‘ اور اللہ اہلِ ایمان کو عنقریب بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔‘‘

یعنی ابھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے‘ سچی توبہ کرنے کے بعد ان کو معافی مل سکتی ہے۔ ابھی ان کے لیے point of no return نہیں آیا ہے۔

آیت ۱۴۷ ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ﴾ ’’(اے منافقو ذرا سوچو!) اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا؟‘‘

اللہ تعالیٰ معاذ اللہ کوئی ایذا پسند (sadist) ہستی نہیں ہے کہ اُسے لوگوں کو دکھ پہنچا کر خوشی ہوتی ہو۔ اس طرح کے رویے تو perverted قسم کے انسانوں کے ہوتے ہیں‘ جن کی

شخصیتیں مسخ ہو چکی ہوتی ہیں‘ جو دوسروں کو تکلیف میں دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں‘ دوسروں کو تکلیف اور کوفت پہنچا کر انہیں راحت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تو ایسا نہیں ہے۔ اس لیے فرمایا کہ اللہ تمہیں عذاب دے کر تم سے کیا لے گا؟

﴿اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ﴾ ”اگر تم شکر اور ایمان کی روش اختیار کرو۔“

﴿وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿١٤٧﴾﴾ ”اور اللہ بہت ہی قدر دانی فرمانے والا اور ہر شے کا علم رکھنے والا ہے۔“

جو بندہ اُس کے لیے کام کرے‘ محنت کرے‘ اللہ تعالیٰ اس کی قدر فرماتا ہے۔ اور جو کوئی جو کچھ بھی کرتا ہے سب اُس کے علم میں ہوتا ہے۔ انسان کا کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو اللہ کے ہاں unaccounted رہ جائے‘ اور اسے اس کا اجر نہ مل سکے۔

اب اس سورۃ کے آخری حصے میں فلسفۂ دین کے بہت اہم بنیادی نکات کی کچھ تفصیل آئے گی۔ اس ضمن میں پہلی بات تو تمدنی اور معاشرتی معاملات ہی سے متعلق ہے۔ معاشرے کے اندر کسی بُری بات کا چرچا کرنا بالفعل کوئی اچھی بات نہیں ہے‘ لیکن اس میں ایک استثناء رکھا گیا ہے‘ اور وہ ہے مظلوم کا معاملہ۔ اگر مظلوم کی زبان سے ظلم کے ردّ عمل کے طور پر کچھ نازیبا کلمات‘ جلے کٹے الفاظ بھی نکل جائیں تو اللہ تعالیٰ انہیں معاف کر دے گا۔

آیت ۱۴۸ ﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾ ”اللہ کو بالکل پسند نہیں ہے کہ کسی بُری بات کو بلند آواز سے کہا جائے‘ سوائے اس کے جس پر ظلم ہوا ہے۔“

جس کا دل دکھا ہے‘ جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے‘ نہ صرف یہ کہ اس کے جواب میں اس کی زبان سے نکلنے والے کلمات پر گرفت نہیں‘ بلکہ مظلوم کی دعا کو بھی قبولیت کی سند عطا ہوتی ہے۔ کسی فارسی شاعر نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے: ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

کہ مظلوم کی آہوں سے ڈرو کہ اس کی زبان سے نکلنے والی فریاد ایسی دعا بن جاتی ہے جس کی قبولیت خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا استقبال کرنے کے لیے عرش سے آتی ہے۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿١٤٨﴾﴾ ”اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔“

اسے سب معلوم ہے کہ جس کے دل سے یہ آواز نکلی ہے وہ کتنا دکھی ہے۔ اس کے احساسات کتنے مجروح ہوئے ہیں۔

آیت ۱۴۹ ﴿اِنۡ تُبۡدُوۡا خَيۡرًا اَوۡ تُخۡفُوۡهُ﴾ ''اگر تم بھلائی کو ظاہر کر دیا اسے چھپاؤ''

جہاں تک تو خیر کا معاملہ ہے تم اسے بلند آواز سے کہو' ظاہر کر دیا چھپاؤ' برابر کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے خیر تو ہر حال میں خیر ہی ہے' عیاں ہو یا خفیہ۔

﴿اَوۡ تَعۡفُوۡا عَنۡ سُوۡٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيۡرًا ۝۱۴۹﴾ ''یا تم برائی کو معاف کر دیا کرو تو یقیناً اللہ بھی معاف فرمانے والا' قدرت رکھنے والا ہے۔''

اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو معاف کر دینا یقیناً نیکی کا ایک اونچا درجہ ہے۔ اس لیے یہاں ترغیب کے انداز میں مظلوم سے بھی کہا جا رہا ہے کہ اگر چہ تمہیں چھوٹ ہے' تمہاری بدگوئی کی بھی تم پر کوئی گرفت نہیں' لیکن زیادتی کی تلافی کا اس سے اعلیٰ اور بلند تر درجہ بھی ہے' تم اس بلند درجے کو حاصل کیوں نہیں کرتے؟ وہ یہ کہ تم اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو معاف کر دو۔ اس کے ساتھ اللہ کی قدرت کا ذکر بھی ہوا ہے کہ انسان تو بسا اوقات بدلہ لینے کی طاقت نہ ہونے کے باعث معاف کرنے پر مجبور بھی ہو جاتا ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے' قدیر ہے' وہ تو جب چاہے' جیسے چاہے (there & then) خطا کار کو فوراً سزا دے کر حساب چکا سکتا ہے۔ لیکن اتنی قدرت کے باوجود بھی وہ معاف فرما دیتا ہے۔

آئندہ آیات میں پھر وحدت الادیان جیسے اہم مضمون کا تذکرہ ہونے جا رہا ہے اور اس سلسلے میں یہاں تمام غلط نظریات کی جڑ کاٹی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے بھی یہ بات زیر بحث آ چکی ہے کہ فلسفۂ وحدتِ ادیان کا ایک حصہ صحیح ہے۔ وہ یہ کہ اصل (origin) سب ادیان کی ایک ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ مختلف ادیان کی موجودہ شکلوں میں بھی یک رنگی اور ہم آہنگی ہے تو اس سے بڑی حماقت' جہالت' ضلالت اور گمراہی کوئی نہیں۔

یہاں پر اب کانٹے کی بات بتائی جا رہی ہے کہ دین میں جس چیز کی وجہ سے بنیادی خرابی پیدا ہوتی ہے وہ اصل میں کیا ہے۔ وہ غلطی یا خرابی ہے اللہ اور رسولوں میں تفریق! ایک تفریق تو وہ ہے جو رسولوں کے درمیان کی جاتی ہے' اور دوسری تفریق اللہ اور رسول ﷺ کو علیحدہ علیحدہ کر دینے کی شکل میں سامنے آتی ہے' اور یہ سب سے بڑی جہالت ہے۔ فتنۂ انکارِ حدیث اور انکارِ سنت اسی جہالت و گمراہی کا شاخسانہ ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو اہلِ قرآن سمجھتے ہیں اور ان کا نظریہ ہے کہ رسول ﷺ کا کام قرآن پہنچا دینا تھا' سو انہوں نے پہنچا دیا' اب اصل معاملہ ہمارے اور اللہ کے درمیان ہے۔ اللہ کی کتاب عربی زبان میں ہے' ہم اس کو خود سمجھیں گے اور

اس پر عمل کریں گے۔ رسول ﷺ نے اپنے زمانے میں مسلمانوں کو جو اس کی تشریح سمجھائی تھی اور اُس زمانے کے لوگوں نے اسے قبول کیا تھا' وہ اُس زمانے کے لیے تھی۔ گویا رسولؐ کی تشریح کوئی دائمی چیز نہیں' دائمی شے صرف قرآن ہے۔ اس طرح انہوں نے اللہ اور رسول ﷺ کو جُدا کر دیا۔ یہاں اسی گمراہی کا ذکر آ رہا ہے۔

آیت ۱۵۰ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو کفر کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں کا اور وہ چاہتے ہیں کہ تفریق کر دیں اللہ اور اس کے رسولوں کے مابین''

اکبر کے ''دینِ الٰہی'' کا بنیادی فلسفہ بھی یہی تھا کہ بس دین تو اللہ ہی کا ہے' رسول ﷺ کی نسبت ضروری نہیں' کیونکہ جب دین کی نسبت رسول کے ساتھ ہو جاتی ہے تو پھر دین رسول کے ساتھ منسوب ہو جاتا ہے کہ یہ دینِ موسیٰؑ ہے' یہ دینِ عیسیٰؑ ہے' یہ دینِ محمد ﷺ ہے۔ اگر رسولوں کا یہ تفرقی عنصر (differentiating factor) درمیان سے نکال دیا جائے تو مذاہب کے اختلافات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اللہ تو سب کا مشترک (common) ہے' چنانچہ جو دین اُسی کے ساتھ منسوب ہوگا وہ دینِ الٰہی ہوگا۔

﴿وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کچھ کو مانیں گے اور کچھ کو نہیں مانیں گے''

یعنی اللہ کو مانیں گے' رسولوں کا ماننا ضروری نہیں ہے۔ اللہ کی کتاب کو مانیں گے' رسول ﷺ کی سنت کا ماننا کوئی ضروری نہیں ہے' وغیرہ وغیرہ۔

﴿وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ﴿۱۵۰﴾﴾ ''اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے بین بین ایک راستہ نکال لیں۔''

اللہ کو ایک طرف کر دیں اور رسول کو ایک طرف۔

آیت ۱۵۱ ﴿اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا ﴿۱۵۱﴾﴾ ''یہی لوگ حقیقت میں پکّے کافر ہیں' اور ہم نے ان کافروں کے لیے بڑا اہانت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

آیت ۱۵۲ ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ﴾ ''اور جو

لوگ ایمان رکھتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں پر اور انہوں نے ان میں سے کسی کے مابین کوئی تفریق نہیں کی''

نہ اللہ کو رسول سے جُدا کیا اور نہ رسول کو رسول سے جُدا کیا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم سب کو مانتے ہیں: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ:۲۸۵)۔ ہم اُن رسولوں کو بھی مانتے ہیں جن کے نام قرآن مجید میں آ گئے ہیں' اور یہ بھی مانتے ہیں کہ ان کے علاوہ بھی اللہ کی طرف سے بے شمار نبی اور رسول آئے ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں اللہ ان کے اجر عطا فرمائے گا' اور اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے۔''

آیات ۱۵۳ تا ۱۶۲

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۝ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا

عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ وَبِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَثِيۡرًا ۙ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخۡذِهِمُ
الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ؕ وَاَعۡتَدۡنَا
لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۶۱﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوۡنَ فِى الۡعِلۡمِ مِنۡهُمۡ
وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ وَالۡمُقِيۡمِيۡنَ
الصَّلٰوةَ وَالۡمُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ اُولٰۤـئِكَ
ع سَنُؤۡتِيۡهِمۡ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۱۶۲﴾

آیت ۱۵۳ ﴿يَسۡـئَلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَيۡهِمۡ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ ''(اے نبی ﷺ) اہلِ کتاب آپؐ سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ ان پر ایک کتاب آسمان سے اتار لائیں''

یعنی جیسے تورات اُتری تھی' ویسے ہی تحریری شکل میں ایک کتاب آسمان سے اترنی چاہیے۔ آپؐ تو کہتے ہیں مجھ پر وحی آتی ہے' لیکن کہاں لکھی ہوئی ہے وہ وحی؟ کون لایا ہے؟ ہمیں تو پتا نہیں۔ موسیٰؑ کو تو اُن کی کتاب لکھی ہوئی ملی تھی اور وہ پتھر کی تختیوں کی صورت میں اسے لے کر آئے تھے۔ آپ پر بھی اسی طرح کی کتاب نازل ہو تو ہم مانیں۔

﴿فَقَدۡ سَاَلُوۡا مُوۡسٰۤى اَكۡبَرَ مِنۡ ذٰلِكَ﴾ ''(یہ تعجب کی بات نہیں) انہوں نے موسیٰؑ سے اس سے بھی بڑھ کر مطالبے کیے تھے''

اے نبی ﷺ آپ فکر نہ کریں' ان کی پروانہ کریں۔ انہوں نے' ان کے آباء واَجداد نے حضرت موسیٰؑ سے اس سے بھی بڑے بڑے مطالبات کیے تھے۔

﴿فَقَالُوۡۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهۡرَةً﴾ ''انہوں نے تو (اُن سے یہ بھی) کہا تھا کہ ہمیں دکھاؤ اللہ کو علانیہ''

کہ ہم خود اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھنا چاہتے ہیں' جب دیکھیں گے تب مانیں گے۔

﴿فَاَخَذَتۡهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلۡمِهِمۡ﴾ ''تو ان کو آ پکڑا تھا کڑک نے ان کے اس گناہ کی پاداش میں۔''

﴿ثُمَّ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ﴾ ''پھر انہوں نے بچھڑے

کومعبود بنالیا اس کے بعد کہ اُن کے پاس بہت واضح نشانیاں آ چکی تھیں''
ان لوگوں کی نا ہنجاری کا اندازہ کریں کہ نو نو معجزے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں دیکھنے کے بعد بھی انہوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔
﴿فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا﴾ ''تو ہم نے ان تمام چیزوں سے بھی درگزر کیا' اور ہم نے موسیٰ کو عطا کیا بڑا واضح غلبہ۔''
فرعون اور اس کے لاؤلشکر کو ان کی آنکھوں کے سامنے غرق کر دیا۔
آیت ۱۵۴ ﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ ''اور ہم نے ان کے سروں پر معلق کر دیا تھا طور پہاڑ کو جب کہ ان سے عہد لیا جا رہا تھا اور ہم نے اُن سے کہا کہ دروازے میں داخل ہوں جھک کر''
یعنی جب اریحا (Jericho) شہر تمہارے ہاتھوں فتح ہو جائے اور اس میں داخل ہونے کا مرحلہ آئے تو اپنے سروں کو جھکا کر عاجزی کے ساتھ داخل ہونا۔
﴿وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ﴾ ''اور ہم نے ان سے (یہ بھی) کہا تھا کہ سبت (ہفتے کے دن کے قانون) میں حد سے تجاوز نہ کرنا''
﴿وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا﴾ ''اور ہم نے ان سے (ان تمام باتوں کے بارے میں) بڑے گاڑھے قول وقرار لیے تھے۔''
آیت ۱۵۵ ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ﴾ ''تو انہوں نے جو اپنے اس میثاق کو توڑ ڈالا اس کے سبب''

اب ان کے جرائم کی فہرست آ رہی ہے' اور یوں سمجھئے کہ مبتدا ہی کی تکرار ہو رہی ہے اور اس میں جو اصل خبر ہے وہ گویا محذوف ہے۔ گویا بات یوں بنے گی: **فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ** کہ انہوں نے جو اپنے میثاق کو توڑا اور توڑتے رہے' ہمارے ساتھ انہوں نے جو بھی وعدے کیے تھے' جب ان کا پاس انہوں نے نہ کیا تو ہم نے ان پر لعنت کر دی۔ لیکن یہ ''لَعَنّٰهُمْ'' اتنی واضح بات تھی کہ اس کو کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی' بلکہ ان کے جرائم کی فہرست بیان کر دی گئی۔
﴿وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ ''اور اُن کے اللہ کی

آیات کے انکار اور انبیاء کو ناحق قتل کرنے (کے سبب سے)‘‘

﴿وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾﴾ ’’اور ان کے اس طرح کہنے (کی پاداش) میں کہ ہمارے دِل تو غلافوں میں بند ہیں۔ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ نے ان (کے دلوں) پر مہر کر دی ہے ان کے کفر کے باعث‘ پس اب وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت ہی شاذ۔‘‘

آیت ۱۵۶ ﴿وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾﴾ ’’اور بسبب ان کے کفر کے اور اُن باتوں کے جو انہوں نے مریم کے خلاف کیں ایک بہت بڑے بہتان کے طور پر۔‘‘

حضرت مریم سلامٌ علیہا پر یہودیوں نے بہتان لگایا کہ انہوں نے (معاذ اللہ) زنا کیا ہے اور مسیحؑ دراصل یوسف نجار کا بیٹا ہے۔ ان کی روایات کے مطابق یوسف نجار کے ساتھ حضرت مریم کی نسبت ہو چکی تھی‘ لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ ان کے مابین تعلق قائم ہو گیا‘ جس کے نتیجے میں یہ بیٹا پیدا ہو گیا۔ اس طرح انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو ولد الزّنا قرار دیا۔ یہ ہے وہ اتنی بڑی بات جو یہودی کہتے ہیں اور آج بھی اس گمراہ کن نظریے پر مبنی ’’Son of Man‘‘ جیسی فلمیں بنا کر امریکہ میں چلاتے ہیں‘ جن میں عیسائیوں کو بتایا جاتا ہے کہ جس مسیح کو تم لوگ Son of God کہتے ہو وہ حقیقت میں son of man ہے۔

آیت ۱۵۷ ﴿وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ﴾ ’’اور بسبب ان کے یہ کہنے کے کہ ہم نے قتل کیا مسیح عیسیٰ ابن مریم کو‘ اللہ کے رسول کو!‘‘

یعنی اللہ کے رسول کو قتل کر دیا! یہاں یہ ’’رَسُوْلَ اللّٰهِ‘‘ کے الفاظ اُن کے نہیں ہیں‘ بلکہ یہ اللہ کی طرف سے ہیں استعجابیہ نشان (sign of exclamation) کے ساتھ‘ کہ اچھا ان کا دعویٰ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے! جبکہ رسول تو قتل ہو ہی نہیں سکتا۔ اللہ کا تو فیصلہ ہے‘ ایک طے شدہ امر ہے‘ اللہ کی طرف سے لکھا ہوا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب آ کر رہیں گے ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ؕ﴾ (المجادلۃ:۲۱) تو ان کی یہ جرأت کہ وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے!

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ﴾ ’’حالانکہ نہ تو انہوں نے اسے قتل

کیا اور نہ ہی اسے سولی دی' بلکہ اس کی شبیہہ بنا دی گئی ان کے لیے۔''

معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا اور ایک شخص کی حضرت مسیحؑ جیسی صورت بنا دی گئی' ان کے ساتھ مشابہت کر دی گئی۔ چنانچہ انہوں نے جس کو مسیح سمجھ کر سولی پر چڑھایا' وہ مسیحؑ نہیں تھا' ان کی جگہ کوئی اور تھا۔ انجیل برنباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا نام ''یہودا اسخریوطی'' (Judas Iscariot) تھا اور وہ آپؑ کے حواریوں میں سے تھا۔ ویسے اُس کی نیت کچھ اور تھی' اس میں بد نیتی بہرحال نہیں تھی (تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے) لیکن چونکہ اُس نے آپؑ کو گرفتار کرایا تھا' چنانچہ اس گستاخی کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے اس کی شکل حضرت مسیح علیہ السلام جیسی بنا دی اور حضرت مسیحؑ کی جگہ وہ پکڑا گیا اور سولی چڑھا دیا گیا۔

﴿وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ﴾ ''اور جو لوگ اس کے بارے میں اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں وہ یقیناً شکوک و شبہات میں ہیں۔''

انہیں خود پتا نہیں کہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟

﴿مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا ۝۱۵۷﴾ ''اُن کے پاس اس ضمن میں کوئی علم نہیں ہے سوائے اس کے کہ گمان کی پیروی کر رہے ہیں' اور یہ بات یقینی ہے کہ انہوں نے اسے قتل نہیں کیا۔''

حضرت مسیح علیہ السلام ہرگز قتل نہیں ہوئے اور نہ ہی آپؑ کو صلیب پر چڑھایا گیا۔

آیت ۱۵۸ ﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ۝۱۵۸﴾ ''بلکہ اللہ نے اسے اٹھا لیا اپنی طرف' اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے کمال حکمت والا۔''

اس واقعہ کی تفصیل انجیل برنباس میں موجود ہے۔

آیت ۱۵۹ ﴿وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ﴾ ''اور نہیں ہوگا اہل کتاب میں سے کوئی بھی مگر اُس پر ایمان لا کر رہے گا اس کی موت سے قبل۔''

یعنی حضرت مسیح علیہ السلام فوت نہیں ہوئے' زندہ ہیں' انہیں آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا اور وہ دوبارہ زمین پر آئیں گے' اور جب آئیں گے تو اہلِ کتاب میں سے کوئی شخص نہیں رہے گا کہ جو ان پر ایمان نہ لے آئے۔

﴿وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكُوْنُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا ۝۱۵۹﴾ ''اور قیامت کے دن وہی ان کے

خلاف گواہ (بن کر کھڑا) ہوگا۔''

یہ گواہی والا معاملہ وہی ہے جس کی تفصیل ہم آیت ۴۱ میں پڑھ آئے ہیں: ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ کہ ہر نبی کو اپنی اُمت کے خلاف گواہی دینی ہے۔ لہٰذا حضرت مسیح علیہ السلام اپنی اُمت کے خلاف گواہی دیں گے۔

آیت ۱۶۰ ﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ﴾ ''تو بسبب اُن یہودی بن جانے والوں کی ظالمانہ روش کے ہم نے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں بھی حرام کر دیں جو اصلاً ان کے لیے حلال تھیں''

اللہ تعالیٰ کی ایک سنت یہ بھی ہے کہ کوئی قوم اگر کسی معاملے میں حد سے گزرتی ہے تو سزا کے طور پر اسے حلال چیزوں سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔ یہاں پر یہی اصول بیان ہو رہا ہے۔ مثلاً اگر حضرت یعقوبؑ نے اونٹ کا گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے تورات میں اس کی صراحت نہیں کی کہ یہ حرام نہیں ہے' یہ تو محض تمہارے نبیؑ کا بالکل ذاتی قسم کا فیصلہ ہے' بلکہ اللہ نے کہا کہ ٹھیک ہے' ان کی یہی سزا ہے کہ ان پر تنگی رہے اور اس طرح ان کے کرتوتوں کی سزا کے طور پر حلال چیزیں بھی اُن پر حرام کر دیں۔

﴿وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿١٦٠﴾﴾ ''اور بسبب اس کے کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے سے (خود رُکتے ہیں اور دوسروں کو بھی) روکتے ہیں۔''

یہ لوگ اللہ کے راستے سے خود بھی رکتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی روکتے ہیں۔ تو اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دی اور ان پر بعض حلال چیزیں بھی حرام کر دیں۔

آیت ۱۶۱ ﴿وَّأَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ﴾ ''اور بسبب ان کے سود کھانے کے جبکہ اس سے انہیں منع کیا گیا تھا''

شریعتِ موسوی میں سود حرام تھا' آج بھی حرام ہے' لیکن انہوں نے اس حکم کا اپنا ایک من پسند مفہوم نکال لیا' جس کے مطابق یہودیوں کا آپس میں سود کا لین دین تو حرام ہے' کوئی یہودی دوسرے یہودی سے سودی لین دین نہیں کر سکتا' لیکن غیر یہودی سے سود لینا جائز ہے' کیونکہ وہ ان کے نزدیک Gentiles اور Goyems ہیں' انسان نما حیوان ہیں' جن سے فائدہ اٹھانا اور ان کا استحصال کرنا ان کا حق ہے۔ ہم سورۂ آلِ عمران (آیت ۷۵) میں یہود کا

یہ قول پڑھ چکے ہیں: ﴿لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ﴾ کہ ان اُمّیّین کے بارے میں ہم پر کوئی گرفت ہے ہی نہیں‘ کوئی ذمہ داری ہے ہی نہیں۔ ہم جیسے چاہیں لوٹ مار کریں‘ جس طرح چاہیں انہیں دھوکہ دیں‘ ہم پر کوئی مواخذہ نہیں۔ لہٰذا سود کھانے میں اُن کے ہاں عمومی طور پر کوئی قباحت نہیں ہے۔

﴿وَاَکْلِھِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ﴾ ’’اور بسبب ان کے لوگوں کے مال ناحق ہڑپ کرنے کے۔‘‘

﴿وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ مِنْھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۶۱﴾﴾ ’’اوران میں سے جو کافر ہیں ان کے لیے ہم نے بہت دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔‘‘

آیت ۱۶۲ ﴿لٰکِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْھُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ ’’البتہ جو لوگ ان میں سے پختہ علم والے ہیں اور اہلِ ایمان ہیں‘‘

یعنی یہود میں سے اہلِ علم لوگ جیسے عبداللہ بن سلام ؓ اور ایسے ہی راست باز لوگ جنہوں نے تورات کے علم کی بنا پر نبی آخر الزمان ﷺ کی تصدیق کی اور آپؐ پر ایمان لائے۔

﴿ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ﴾ ’’وہ ایمان رکھتے ہیں اُس پر جو (اے نبیؐ) آپؐ پر نازل کیا گیا اور اُس پر بھی جو آپؐ سے پہلے نازل کیا گیا‘‘

﴿وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ﴾ ’’اور وہ نماز قائم کرنے والے ہیں‘ زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں‘ اور ایمان رکھنے والے ہیں اللہ پر بھی اور یومِ آخرت پر بھی‘‘

﴿اُولٰٓئِکَ سَنُؤْتِیْھِمْ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۱۶۲﴾﴾ ’’یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم ضرور اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے۔‘‘

ان آیات میں ابھی بھی تھوڑی سی گنجائش رکھی جا رہی ہے کہ اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا عنصر اگر اب بھی موجود ہو جو حق کی طرف مائل ہو‘ اب بھی اگر کوئی سلیم الفطرت فرد کہیں کونے کھدرے میں پڑا ہو‘ اگر اس کان میں ہیرے کا کوئی ٹکڑا کہیں ابھی تک پڑا رہ گیا ہو‘ تو وہ بھی نکل آئے اس سے پہلے کہ آخری دروازہ بھی بند کر دیا جائے۔ تو ابھی آخری دروازہ نہ تو منافقین پر بند کیا گیا ہے اور نہ ان اہلِ کتاب پر‘ بلکہ لٰکِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ فرما کر ایک دفعہ پھر

صلائے عام دے دی گئی ہے کہ اہلِ کتاب میں سے اب بھی اگر کچھ لوگ مائل بہ حق ہیں تو وہ متوجہ ہو جائیں۔

آیات ۱۶۳ تا ۱۶۹

اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْکَ کَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِہٖ ۚ وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِیْسٰی وَاَیُّوْبَ وَیُوْنُسَ وَھٰرُوْنَ وَسُلَیْمٰنَ ۚ وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰھُمْ عَلَیْکَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْھُمْ عَلَیْکَ ؕ وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا ﴿۱۶۴﴾ رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ﴿۱۶۵﴾ لٰکِنِ اللّٰہُ یَشْھَدُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اِلَیْکَ اَنْزَلَہٗ بِعِلْمِہٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یَشْھَدُوْنَ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا ﴿۱۶۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ طَرِیْقًا ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِیْقَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَاۤ اَبَدًا ؕ وَکَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرًا ﴿۱۶۹﴾

اس رکوع کے شروع میں انبیاء اور رسولوں کے ناموں کا ایک خوبصورت گلدستہ نظر آتا ہے۔ قرآن پاک میں متعدد ایسے مقامات ہیں جہاں ایسے گلدستے خوبصورتی سے سجائے گئے ہیں۔ یہاں آپ کو پے بہ پے انبیاء اور رسولوں کے نام ملیں گے اور پھر ان میں سے بعض کی اضافی شانوں کا ذکر بھی ملے گا۔ اس کے بعد فلسفۂ قرآن کے اعتبار سے ایک بہت اہم آیت بھی آئے گی، جس میں نبوت کا بنیادی مقصد اور اساسی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔

آیت ۱۶۳ ﴿اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْکَ کَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِہٖ ۚ﴾ ”(اے نبی ﷺ) ہم نے آپؐ کی جانب بھی وحی کی ہے جیسے ہم نے نوحؑ اور ان کے بعد بہت سے انبیاء پر وحی کی تھی۔“

﴿وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ﴾ ”اور ہم

[کی طرف] ابراہیمؑ' اسماعیلؑ' اسحاقؑ' یعقوبؑ اور اُن کی اولاد کی طرف بھی وحی کی''

﴿وَعِيسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾﴾ ''اور عیسیٰؑ' ایوبؑ' یونسؑ' ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف (بھی وحی کی)۔ اور داؤدؑ کو تو ہم نے [ز]بور (جیسی کتاب) عطا فرمائی۔''

[آ]یت ۱۶۴ ﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ [عَ]لَيْكَ ۭ﴾ ''اور (بھیجے) وہ رسول جن کا ہم اس سے پہلے آپؐ کے سامنے تذکرہ کر چکے [ہ]یں اور ایسے رسول (بھی) جن کے حالات ہم نے آپؐ کے سامنے بیان نہیں کیے''

پوری دنیا کی تاریخ بیان کرنا تو قرآن مجید کا مقصد نہیں ہے کہ تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام کی [م]کمل فہرست دے دی جاتی۔ یہ تو کتابِ ہدایت ہے' تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔

﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾﴾ ''اور موسیٰؑ سے تو کلام کیا اللہ نے جیسے کہ کلام کیا جاتا ہے۔''

یہ خاص حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امتیازی شان بیان ہوئی ہے۔ لیکن یہ مکالمہ مِنْ وَرَآءِ [حِ]جَابٍ تھا' یعنی پردے کے پیچھے سے' البتہ تھا دُو بدُو کلام۔ اب اس کے بعد وہ آیت آ رہی [ہ]ے جس میں نبوت کا اساسی مقصد بیان ہوا ہے کہ یہ تمام رسولؑ کس لیے بھیجے گئے تھے۔

آیت ۱۶۵ ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ ''یہ رسولؑ (بھیجے گئے) بشارت دینے [و]الے اور خبردار کرنے والے بنا کر''

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ﴾ ''تا کہ نہ رہ جائے [ل]وگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت (دلیل) رسولوں کے آنے کے بعد۔''

یہاں پر ایک طرف لِلنَّاسِ کا 'ل' نوٹ کیجیے اور دوسری طرف عَلَى اللّٰهِ کا عَلٰی۔ [ی]ہ دونوں حروف متضاد معانی پیدا کر رہے ہیں۔ لِلنَّاسِ کے معنی ہیں لوگوں کے حق میں حجت' [ج]بکہ عَلَى اللّٰهِ کے معنی ہیں اللہ کے خلاف حجت۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾﴾ ''اور اللہ زبردست ہے' حکمت والا ہے۔''

اب آپ آخرت کے احتساب کے فلسفے کو سمجھئے۔ قیامت کے دن ہر کسی کا امتحان ہوگا اور [ا]متحان سے پھر نتائج نکلیں گے' کوئی پاس ہوگا اور کوئی فیل۔ لیکن امتحان سے پہلے کچھ پڑھایا جانا

بھی ضروری ہے‘ کسی کو جانچنے سے پہلے اُسے کچھ دیا بھی جاتا ہے۔ چنانچہ ہمیں دیکھنا ہے کہ قیامت کے امتحان کے لیے ہمیں کیا پڑھایا گیا ہے؟ اس آخری جانچ پڑتال سے پہلے ہمیں کیا کچھ دیا گیا ہے؟ قرآن مجید کے بنیادی فلسفہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کو سمع‘ بصر اور عقل تین بڑی چیزیں دی ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر روح بھی ودیعت کی ہے اور نفسِ انسانی میں خیر اور شر کا علم بھی رکھا ہے۔ ان باتوں کی بنا پر انسان وحیٔ الٰہی کی راہنمائی کے بغیر بھی اللہ کے حضور جواب دہ (accountable) ہے کہ جب تمہاری فطرت میں نیکی اور بدی کی تمیز رکھ دی گئی تھی تو تم بدی کی طرف کیوں گئے؟ تو گویا اگر کوئی نبی یا رسول نہ بھی آتا‘ کوئی کتاب نازل نہ بھی ہوتی‘ تب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے محاسبہ ناحق نہیں تھا۔ اس لیے کہ وہ بنیادی چیزیں جو امتحان اور احتساب کے لیے ضروری تھیں وہ اللہ تعالیٰ انسان کو دے چکا تھا۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی سنّت یہ رہی ہے کہ وہ پھر بھی انسانوں پر اتمامِ حجت کرتا ہے۔ اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ حجت کیا ہے؟ بنیادی حجت تو عقل ہے جو اللہ نے ہمیں دے رکھی ہے: ﴿اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا﴾ (بنی اسرائیل)۔ انسانی نفس کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز بھی ودیعت کر دی گئی ہے: ﴿وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۝﴾ (الشمس) پھر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح پھونکی گئی ہے۔ ان تمام صلاحیتوں اور اہلیتوں کی بنا پر جوابدہی (accountability) کا جواز برحق ہے۔ کوئی نبی آتا یا نہ آتا‘ اللہ کی یہ حجت تمام انسانوں پر بہرحال قائم ہے۔

اس کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ نے اتمامِ حجت کرنے کے لیے اپنے نبی اور رسول بھیجے۔ یہ اضافی شے ہے کہ اللہ نے تم ہی میں سے کچھ لوگوں کو چنا‘ جو بڑے ہی اعلیٰ کردار کے لوگ تھے۔ تم جانتے تھے کہ یہ ہمارے ہاں کے بہترین لوگ ہیں‘ ان کے دامنِ کردار پر کوئی داغ دھبہ نہیں ہے‘ ان کی سیرت و اخلاق کھلی کتاب کی مانند تمہارے سامنے تھے۔ ان کے پاس اللہ نے اپنی وحی بھیجی اور واضح طور پر بتا دیا کہ انسان کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ اس طرح اُس نے تمہارے لیے اس امتحان کو آسان کر دیا‘ تاکہ اب کسی کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے‘ کوئی یہ دلیل پیش نہ کر سکے کہ مجھے تو علم ہی نہیں تھا۔ پروردگار! میں تو بے دین ماحول میں پیدا ہو گیا تھا‘ وہاں سب کے سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ پروردگار! میں تو اپنی دو وقت کی روٹی کے دھندے میں ہی ایسا مصروف رہا کہ مجھے کبھی ہوش ہی نہیں آیا کہ دین و ایمان

...دو آخرت کے بارے میں سوچتا۔لیکن جب رسولؑ آ جاتے ہیں اور رسولوں کے آنے کے ...ق کھل کر سامنے آ جاتا ہے' حق و باطل کے درمیان امتیاز بالکل واضح طور پر قائم ہو جاتا ہے ...ر کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے محاسبہ کے مقابلے میں پیش کرنے ...کے لیے کوئی حجت باقی نہیں رہتی۔تو یہ ہے اتمامِ حجت کا فلسفہ اور طریقہ اللہ کی طرف سے۔ ...ولؑ اس کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں؟ کسی کو زبردستی تو ہدایت پر نہیں لا سکتے۔ہاں جن کے ...ر احساس جاگ جائے گا وہ رسولؑ کی تعلیمات کی طرف متوجہ ہوں گے' ان سے فائدہ ...ائیں گے' سیدھے راستے پر چلیں گے۔ان کے لیے اللہ کے رسول ''مبشر'' ہوں گے' اللہ ...کے فضل اور جنت کی نعمتوں کی بشارت دینے والے: ﴿فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيمٍ﴾ (...الواقعہ)۔اور جو لوگ اس کے بعد بھی غلط راستوں پر چلتے رہیں گے' تعصب میں' ضد اور ...ٹ دھرمی میں' مفادات کے لالچ میں' اپنی چودھراہٹیں قائم رکھنے کے لالچ میں' ان کے لیے ...سولؑ ''نذیر'' ہوں گے۔اُن کو خبردار کریں گے کہ اب تمہارے لیے بدترین انجام کے طور پر ...جہنم تیار ہے۔تو رسولوںؑ کی بعثت کا بنیادی مقصد یہی ہے' یعنی تبشیر اور انذار۔

اس ساری وضاحت کے بعد اب دوبارہ آیت کے الفاظ کو سامنے رکھیے: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ﴾ ''رسول بھیجے گئے بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر'' یہ تبشیر اور انذار کس لیے؟ ﴿لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ﴾ ''تاکہ باقی نہ رہ جائے لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت' کوئی عذر' کوئی بہانہ' رسولوں کے آنے کے بعد''۔﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ ''اور اللہ زبردست ہے' حکیم ہے''۔وہ عزیز ہے' غالب ہے' زبردست ہے' بغیر رسولوں کے بھی محاسبہ کر سکتا ہے' اس کا اختیار مطلق ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ حکیم بھی ہے' اُس نے محاسبۂ اُخروی کے لیے یہ مبنی برحکمت نظام بنایا ہے۔

اس ضمن میں ایک بات اور نوٹ کر لیجیے کہ رسالت کا ایک تکمیلی مقصد بھی ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر کامل ہوا' اور وہ ہے روئے ارضی پر اللہ کے دین کو غالب کرنا۔آپؐ نے دعوت کا آغاز اسی تبشیر اور انذار ہی سے فرمایا' جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝﴾ بحیثیتِ رسولؑ یہ آپؐ کی رسالت کے بنیادی مقصد کا اظہار ہے' لیکن اس سے بلند تر درجے میں آپؐ کی رسالت کی تکمیلی حیثیت کا اظہار سورۃ التوبہ آیت ۳۳' سورۃ الفتح آیت ۲۸

اورسورۃ الصّف آیت ۹ میں ایک جیسے الفاظ میں ہوا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ ”وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق دے کر تاکہ وہ اسے غالب کر دے پورے دین پر“۔ تمام انبیاء ورسل علیہم السلام میں یہ آپؐ کی امتیازی شان ہے۔ میری کتاب ”نبی اکرمﷺ کا مقصدِ بعثت“ میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

آیت ۱۶۶ ﴿لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۱۶۶﴾ ”لیکن اللہ گواہ ہے کہ جو کچھ اُس نے نازل کیا ہے (اے نبیﷺ) آپؐ کی طرف وہ اُس نے نازل کیا ہے اپنے علم سے‘ اور فرشتے بھی اس پر گواہ ہیں‘ اگرچہ اللہ (اکیلا ہی) گواہ ہونے کے اعتبار سے کافی ہے۔“

آیت ۱۶۷ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۶۷﴾ ”بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا (خود کو بھی اور دوسروں کو بھی) تو یقیناً وہ گمراہی میں بہت دُور نکل گئے ہیں۔“

اب آخری رسولؐ کے آنے کے بعد بھی جو لوگ کفر پر اَڑے رہے‘ اللہ کے راستے سے رُکے رہے اور دوسروں کو بھی روکتے رہے‘ وہ راہِ حق سے بہک گئے‘ بھٹک گئے‘ اور اپنے بھٹکنے میں‘ بہکنے میں‘ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں۔

آیت ۱۶۸ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۝۱۶۸﴾ ”یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ظلم (شرک) کے مرتکب ہوئے اللہ انہیں ہرگز بخشنے والا نہیں ہے‘ اور نہ انہیں کسی راستے کی ہدایت دے گا۔“

آیت ۱۶۹ ﴿اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۱۶۹﴾ ”سوائے جہنم کے راستے کے جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے‘ اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔“

اب ذرا اس آیت کا تقابل کیجیے آیت ۱۴۷ کے ساتھ ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ......﴾ ”اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا......؟“ یقیناً اللہ ایذا پسند (sadist) نہیں ہے‘ اُسے لوگوں کو عذاب دے کر خوشی نہیں ہوگی۔ لیکن یہ اُس کا ضابطہ اور قانون ہے‘ اسی پر اس نے دنیا

بنائی ہے' اور اپنے اسی ضابطے اور قانون کے عین مطابق وہ مستحقین کو جزا و سزا دے گا۔ یہ اُس پر کوئی بھاری گزرنے والی بات نہیں ہے کہ وہ اپنی ہی مخلوق کو سزا دے۔ بعض ملنگ قسم کے صوفی اس طرح کی باتیں بھی کرتے ہیں کہ اللہ بڑا رحیم ہے' کیا وہ اپنی ہی مخلوق کو جہنم میں جھونک دے گا؟ یہ تو ایسے ہی ڈراوے کے لیے' لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے عذاب اور سزا کی باتیں کی گئی ہیں۔ جیسے باپ بچوں کو ڈانٹتا ہے میں تیری ہڈیاں توڑ دوں گا' ماں کہتی ہے میں تیرا قیمہ کر دوں گی۔ تو کیا وہ سچ مچ اپنے بچوں کا قیمہ کر دے گی؟ لہٰذا یہ تو صرف ڈراوا ہے' حقیقت میں ایسا نہیں ہوگا' وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے خیالات و نظریات گمراہ کن ہیں۔ ماں کے لیے تو اپنے بچے کو بڑے سے بڑے قصور پر بھی آگ میں ڈالنا ممکن نہیں ہے' مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا۝﴾ اللہ کے لیے یہ بہت آسان ہے' بہت ہلکی بات ہے۔

آیات ۱۷۰ تا ۱۷۵

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ
وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۝
يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ
عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ٞ
فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ
وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ
وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۝ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰۤئِكَةُ ع ۹/۲۳
الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ
جَمِيْعًا۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ
وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ
عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا۝ يٰۤاَيُّهَا
النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا۝ فَاَمَّا

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾

اب اگلی آیات ایک طرح سے اِس سورۃ کا ''حرفِ آخر'' ہیں۔

آیت ۱۷۰ ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ﴾ ''اے لوگو! تمہارے پاس آچکا ہے رسولؐ حق کے ساتھ' تو اب تم ایمان لے آؤ' یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔''

بلکہ آخری الفاظ کا صحیح تر ترجمہ یہ ہوگا کہ ''ایمان لے آؤ' اسی میں تمہاری خیریت ہے''۔

اس آیت کے ایک ایک لفظ میں بہت زور اور جلال ہے اور اب بات بالکل دوٹوک انداز اور حتمی طور پر کی جارہی ہے۔ یعنی اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ کی طرف سے کوئی راہنمائی نہیں کی گئی' ہمیں کچھ پتا نہیں تھا' ہم پر بات واضح نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے آخری نبی ﷺ کے آجانے کے بعد تمہارا یہ بہانہ اب ختم ہوگیا۔

﴿وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾﴾ ''اور اگر تم لوگ کفر پر اَڑے رہو گے تو (اللہ کا کیا بگاڑ لو گے؟) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا ہے' اور اللہ علیم بھی ہے' حکیم بھی۔''

آگے اہل کتاب سے جو خطاب ہے اس کے مخاطب خاص طور پر عیسائی ہیں' جو حضرت مسیح علیہ السلام کی عقیدت ومحبت میں حد سے گزر گئے تھے۔

آیت ۱۷۱ ﴿يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ﴾ ''اے اہلِ کتاب' اپنے دین میں غلو (مبالغہ) نہ کرو' اور اللہ کی طرف کوئی شے منسوب نہ کرو سوائے اس کے جو حق ہو۔''

تم آپس کے معاملات میں تو جھوٹ بولتے ہی ہو' مگر اللہ کے بارے میں جھوٹ گھڑنا' جھوٹ بول کر اللہ پر اسے تھوپنا کہ اللہ کا یہ حکم ہے' اللہ نے یوں کہا ہے' یہ تو وہی بات ہوئی:

بازی بازی باریشِ بابا ہم بازی!

﴿اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ ''دیکھو مسیح عیسیٰؑ ابنِ مریم تو بس اللہ کے رسولؑ تھے''

وہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ایک رسولؑ تھے اور بس! اُلوہیّت میں ان کا کوئی حصّہ نہیں ہے' وہ خدا کے بیٹے نہیں ہیں۔

﴿وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ﴾ ''اور وہ اُس کا ایک کلمہ تھے' جو اُس نے اِلقا کیا مریم پر اور ایک روح تھے اُس کی طرف سے''

یعنی حضرت مریمؑ کے رحم میں جو حمل ہوا تھا وہ اللہ کے کلمۂ کُن کے طفیل ہوا۔ بچے کی پیدائش کے طبعی عمل میں ایک حصہ باپ کا ہوتا ہے اور ایک ماں کا۔ اب حضرت مسیحؑ کی ولادت میں ماں کا حصہ تو پورا موجود ہے۔ حضرت مریمؑ کو حمل ہوا' نو مہینے آپؑ رحم میں رہے' لیکن یہاں باپ والا حصہ بالکل نہیں ہے اور باپ کے بغیر ہی آپؑ کی پیدائش ممکن ہوئی۔ ایسے معاملات میں جہاں اللہ کی مشیّت سے ایک لگے بندھے طبعی عمل میں سے اگر کوئی کڑی اپنی جگہ سے ہٹائی جاتی ہے تو وہاں پر اللہ کا مخصوص امر کلمۂ کُن کی صورت میں کفایت کرتا ہے۔ یہاں پر اللہ کے ''کلمہ'' کا یہی مفہوم ہے۔

جہاں تک حضرت مسیح علیہ السلام کو ''رُوْحٌ مِّنْهُ'' قرار دینے کا تعلق ہے تو اگرچہ سب انسانوں کی روح اللہ ہی کی طرف سے ہے' لیکن تمام روحیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ بعض روحوں کے بڑے بڑے اونچے مراتب ہوتے ہیں۔ ذرا تصور کریں روحِ محمدی ﷺ کی شان اور عظمت کیا ہوگی! روحِ محمدیؐ کو عام طور پر ہمارے علماء ''نورِ محمدیؐ'' کہتے ہیں۔ اس لیے کہ روح ایک نورانی شے ہے۔ ملائکہ بھی نور سے پیدا ہوئے ہیں اور انسانی ارواح بھی نور سے پیدا ہوئی ہیں۔ لیکن سب انسانوں کی ارواح برابر نہیں ہیں۔ حضور ﷺ کی روح کی اپنی ایک شان ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح کی اپنی ایک شان ہے۔

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۚ﴾ ''پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر' اور تثلیث (تین خداؤں) کا دعویٰ مت کرو۔''

﴿اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ﴾ ''باز آجاؤ' اسی میں تمہاری بہتری (خیریت) ہے۔''

یہ مت کہو کہ الوہیت تین میں ہے۔ ایک میں تین اور تین میں ایک کا عقیدہ مت گھڑو۔

﴿اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ﴾ ''جان لو کہ اللہ تو بس ایک ہی الٰہِ واحد ہے' وہ اس سے پاک ہے کہ اُس کا کوئی بیٹا ہو۔''

﴿لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾﴾ ''آسمانوں

اور زمین میں جو کچھ ہے سب کچھ اُسی کا ہے' اور اللہ کافی ہے بطورِ کارساز۔''

آیت ۱۷۲ ﴿لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰہِ وَلَا الْمَلٰٓئِکَۃُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ ''مسیح کو تو اس میں ہرگز کوئی عار نہیں ہے کہ وہ بنے اللہ کا بندہ اور نہ ہی ملائکہ مقربین کو اس میں کوئی عار ہے (کہ انہیں اللہ کا بندہ سمجھا جائے)۔''

مسیح علیہ السلام کو تو اللہ کا بندہ ہونے میں اپنی شان محسوس ہوگی۔ جیسے ہم بھی حضور ﷺ کے بارے میں کہتے ہیں: وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ۔تو عبدیت کی شان تو بہت بلند و بالا ہے' رسالت سے بھی اعلیٰ اور اَرفع۔ (یہ ایک علیحدہ مضمون ہے' جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔) چنانچہ حضرت مسیح کے لیے یہ کوئی عار کی بات نہیں ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں۔

﴿وَمَنْ یَّسْتَنْکِفْ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَیَسْتَکْبِرْ فَسَیَحْشُرُھُمْ اِلَیْہِ جَمِیْعًا ﴿۱۷۲﴾﴾ ''اور جو کوئی بھی عار سمجھے گا اُس کی بندگی میں اور تکبر کرے گا تو اللہ ان سب کو اپنے پاس جمع کر لے گا۔''

آیت ۱۷۳ ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْھِمْ اُجُوْرَھُمْ وَیَزِیْدُھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ﴾ ''پس جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور انہوں نے نیک عمل کیے ہوں گے تو ان کو تو ان کا پورا پورا اجر بھی دے گا اور انہیں مزید بھی دے گا اپنے خاص فضل میں سے۔''

ایسے لوگوں کو ان کے اجر کے علاوہ بونس بھی ملے گا۔ جیسے آپ کسی کام کرنے والے کو اچھا کام کرنے پر اُجرت کے علاوہ انعام (tip) بھی دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ فضل سے انہیں ان کے مقررہ اجر سے بڑھ کر نوازے گا۔

﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْتَنْکَفُوْا وَاسْتَکْبَرُوْا فَیُعَذِّبُھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا﴾ ''اور جنہوں نے (عبدیت کے اندر) عار محسوس کی تھی اور تکبر کیا تھا تو ان کو وہ دردناک عذاب دے گا''

﴿وَّلَا یَجِدُوْنَ لَھُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ﴿۱۷۳﴾﴾ ''اور وہ نہیں پائیں گے اپنے لیے اللہ کے مقابلے میں کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار۔''

آیت ۱۷۴ ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمْ بُرْھَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ﴾ ''اے لوگو! آ چکی ہے

تمہارے پاس ایک برہان تمہارے ربّ کی طرف سے“

یہ قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ دونوں کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن اور محمد ﷺ مل کر برہان ہوں گے۔ تعارفِ قرآن کے دوران ذکر ہو چکا ہے کہ کتاب اور رسول ﷺ مل کر بیّنہ بنتے ہیں‘ جیسا کہ سورۃ البیّنہ (آیات ۱ تا ۳) میں ارشاد ہوا ہے۔ آیت زیرِ مطالعہ میں اسی بیّنہ کو بُرھان کہا گیا ہے۔

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴾ ”اور ہم نے تمہاری طرف روشن نور نازل کر دیا ہے۔“

یہاں چونکہ نور کے ساتھ لفظ انزال آیا ہے اس لیے اس سے مراد لازماً قرآن مجید ہی ہے۔

آیت ۱۷۵ ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ﴾ ”پس جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں گے اور اُس کے ساتھ چمٹ جائیں گے“

یکسو ہو جائیں گے‘ خالص اللہ والے بن جائیں گے‘ مذبذب نہیں رہیں گے کہ کبھی اِدھر کبھی اُدھر‘ بلکہ پوری طرح سے یکسو ہو کر اللہ کے دامن سے وابستہ ہو جائیں گے۔

﴿فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴾ ”تو انہیں وہ داخل کرے گا اپنی رحمت اور اپنے فضل میں‘ اور انہیں ہدایت دے گا اپنی طرف صراطِ مستقیم کی۔“

یَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ یعنی اپنی طرف ہدایت دے گا۔ انہیں سیدھے راستے (صراطِ مستقیم) پر چلنے کی توفیق بخشے گا اور سہج سہج‘ رفتہ رفتہ انہیں اپنے خاص فضل و کرم اور جوارِ رحمت میں لے آئے گا۔

آیت ۱۷۶

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاۗءً

فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

اس آخری آیت میں پھر ایک استفتاء ہے۔ آیت ۱۲ میں قانونِ وراثت کے ضمن میں ایک لفظ آیا تھا کلالہ' یعنی وہ مرد یا عورت جس کے نہ تو والدین زندہ ہوں اور نہ اس کی کوئی اولاد ہو۔ اس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ اگر اُس کے بہن بھائی ہوں تو اس کی وراثت کا حکم یہ ہے۔ لیکن وہ حکم لوگوں پر واضح نہیں ہو سکا تھا۔ لہٰذا یہاں اس حکم کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ آیت ۱۲ کے حکم کو صرف اَخیافی بہن بھائیوں کے ساتھ مخصوص مان لینے کے بعد اس توضیحی حکم میں کلالہ کی وراثت کا ہر پہلو واضح ہو جاتا ہے۔

آیت ۱۷۶ ﴿يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ﴾ ''(اے نبیﷺ) یہ آپ سے فتویٰ مانگ رہے ہیں۔ کہو کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دے رہا ہے۔''

﴿اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ﴾ ''اگر کوئی شخص فوت ہو گیا اور اس کی کوئی اولاد نہیں (اور نہ ماں باپ ہیں) اور اس کی صرف ایک بہن ہے تو اس کے لیے اس کے ترکے میں سے نصف ہے۔''

ایسی صورت میں اس کی بہن ایسے ہی ہے جیسے ایک بیٹی ہو تو اسے ترکے میں سے آدھا حصہ ملے گا۔

﴿وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ﴾ ''اور وہ مرد (بھائی) اس (بہن) کا مکمل وارث ہوگا اگر اس (بہن) کی کوئی اولاد نہیں۔''

یعنی اگر کلالہ عورت تھی جس کی کوئی اولاد نہیں' کوئی والدین نہیں تو اس کا وارث اس کا بھائی بن جائے گا' اس کی پوری وراثت اس کے بھائی کو چلی جائے گی۔

﴿فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ﴾ ''پھر اگر دو (یا دو سے زیادہ) بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حق دار ہوں گی۔''

﴿وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ﴾ ''اور اگر کئی بہن بھائی ہوں تو ایک مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہوگا۔''

(باقی صفحہ 48 پر)

اسلام کا اَخلاقی اور رُوحانی نظام

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار أحمد حفظہ اللہ

بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ نے ''اسلام کا نظامِ حیات'' کے موضوع پر اگرچہ متعدد بار اظہارِ خیال فرمایا ہے' مگر آج سے لگ بھگ بیس برس قبل اس ضمن میں ایک نہایت مربوط سلسلۂ خطابات ارشاد فرمایا تھا۔ اس سلسلے کا پہلا خطاب ''اسلامی نظام کی نظریاتی اساس: ایمان'' گزشتہ ماہ میثاق میں شائع کیا گیا تھا۔ اب اس سلسلے کا دوسرا خطاب ''اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام'' مرکز تعلم و تحقیق' قرآن اکیڈمی' یاسین آباد' کراچی کے فیلو جناب اویس پاشا قرنی کی ترتیب وتخریج کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ خطاب کی طوالت اور ''میثاق'' کی تنگ دامانی کے باعث صفحات ذیل میں اس خطاب کا صرف پہلا حصہ نذر قارئین ہے۔ (ادارہ میثاق)

خطبہ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (الشّمس)

وقال اللّٰہ تعالیٰ:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ
بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓىِٕكَ
كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (الاعراف)

وقال عزو جل:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ

مَّسۡنُوۡنٍ ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ ﴿۲۹﴾

(الحجر)

وقال تبارك وتعالىٰ:

وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ ؕ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۸۵﴾ (بنی اسراء یل)

وفي الحديث:

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ :((اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَالَ : مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ' وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِ ' وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ ' فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ' وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ' وَیَدَہُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا' وَرِجْلَہُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِھَا' وَلَئِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّہٗ' وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّہٗ)) (۱)

معزز حاضرین ومحترم خواتین!

جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے' دو موضوعات کو یہاں پر جمع کیا گیا ہے: ''اسلام کا اخلاقی نظام'' اور ''اسلام کا روحانی نظام''۔ اس لیے کہ یہ دونوں انتہائی مربوط ہیں اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک ہی موضوع کی دو سطحیں (levels) ہیں۔ مؤخر الذکر کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مقدم الذکر سے بلند تر ہے' یا بالفاظِ دیگر وہ اسی مضمون کا عمیق تر پہلو ہے۔

خطاب کا پس منظر

مئی ۱۹۸۸ء کے ''حکمتِ قرآن'' میں میری چند تحریریں شائع ہوئی تھیں جو ان دونوں موضوعات سے متعلق ہیں۔ ''حقیقتِ زندگی''، ''حقیقتِ انسان'' اور ''عظمتِ صوم''۔(۲) میرے ان مضامین میں بہت سے مسائل جو عرفِ عام میں تصوف سے متعلق ہیں' زیر بحث

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب التواضع۔

(۲) اب یہ تحریریں دو کتابچوں کی صورت میں دستیاب ہیں۔ (۱) زندگی' موت اور انسان (۲) عظمتِ صوم۔ شائع کردہ مکتبہ خدام القرآن لاہور (مرتب)

ئے ہیں۔ میں نے ''عرفِ عام'' کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ مَیں بعد میں عرض کروں گا کہ تصوّف کی اصطلاح دراصل بہت سے مغالطوں کا موجب بنی ہے۔ اگرچہ اس کا موضوع قرآن وسنت کے اہم موضوعات میں سے ہے' لیکن چونکہ ہمارے ہاں اس موضوع پر بہت ردّوقدح اور بحث تمحیص ہے' پھر ایک جانب غلو ہے تو دوسری جانب انتہا پسندی' لہٰذا میرے پاس بہت سے خطوط آئے اور بہت سے حضرات نے گفتگو کی' بعض جرائد نے اس پر تبصرے کیے۔ پھر رفقائے تنظیم اسلامی اور انجمن خدام القرآن کے احباب بھی مطالبہ کرتے رہے کہ اب میں اس موضوع پر اپنے خیالات کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کروں۔ تحریر کا تو مجھے اب تک موقع نہیں مل سکا' تاہم میں کوشش کروں گا کہ آج اپنی بات وضاحت سے آپ حضرات کے سامنے رکھوں۔ ان چند تمہیدی گزارشات کے بعد میں اس موضوع کے پہلے حصے کی جانب بڑھتا ہوں۔

(حصہ اول)

اسلام کا اَخلاقی نظام

اس عنوان کے ذیل میں تین باتیں ہیں جو میں ترتیب کے ساتھ آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

اسلام میں اخلاقِ حَسنہ کی اہمیت

پہلی بات جو میرے نزدیک کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ کے درجے میں ہے' یاددہانی کے طور پر عرض کی جاتی ہے اور ہم میں سے کسی کے لیے یہ نئی بات نہیں ہوگی' لیکن اس گفتگو کا حق ادا نہیں ہوسکتا اگر ان حقائق کو تازہ نہ کرلیا جائے۔ وہ بات یہ ہے کہ اسلام میں اخلاق کی اہمیت اس درجہ ہے کہ جب نبی اکرمﷺ سے دریافت کیا گیا: ((اَیُّ الْاِیْمَانِ اَفْضَلُ؟)) اے اللہ کے رسولﷺ فرمایئے کہ سب سے افضل' سب سے اعلیٰ اور سب سے عمدہ ایمان کون سا ہے؟ تو جواب میں آپﷺ نے فرمایا: ((خُلُقٌ حَسَنٌ))[۳] یعنی وہ ایمان جس کے ساتھ اخلاقِ حسنہ موجود ہوں۔ اسی طرح دوسری حدیث میں یہ قولِ مبارک سامنے آتا ہے: ((اَکْمَلُ

(۳) مسند احمد بن حنبل' مسند العشرۃ المبشرین بالجنۃ' تتمۃ مسند الکوفین' حدیث عمرو بن عبسۃ۔

الْمُؤْمِنِینَ اِیمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا))(٤) ''اہل ایمان میں سب سے زیادہ کامل الایمان شخص وہ ہے جو اخلاق میں سب سے عمدہ ہے''۔ یعنی جس کے اخلاق سب سے اعلیٰ ہیں۔

ہمارے سامنے وہ آیاتِ قرآنیہ بھی ہیں جن میں نبی اکرمﷺ کے اخلاقِ عالیہ سے متّصف ہونے کا تذکرہ ہے' جیسے سورۂ نٓ (القلم) کی ابتدائی آیات جو بعض محققین کے نزدیک دوسری وحی ہے جو حضورﷺ پر نازل کی گئی:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ① مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ② وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ③ وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ④﴾

''نون۔ (اے نبیﷺ) قسم ہے قلم کی اور اُس چیز کی جسے (لکھنے والے) لکھ رہے ہیں کہ آپ اپنے ربّ کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ یقیناً آپ کے لیے تو کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ اور بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر ہیں۔''

اے نبیﷺ اگر کوئی آپ کو مجنون کہہ رہا ہے تو آپ دل گرفتہ نہ ہوں۔ ان کے کہنے سے آپ مجنون نہیں ہو جائیں گے۔ آپ کے اخلاق تو خود منہ بولتا ثبوت ہیں کہ آپ کی شخصیت نہایت متوازن ہے۔ آپؐ کے اخلاق تو انتہائی اعلیٰ ہیں: ﴿اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾۔

بعض احادیث مبارکہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایمان اور اخلاقِ حسنہ لازم وملزوم ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَیْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا اللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِیِّ))(٥)

''مؤمن کبھی بھی طعنے دینے والا' لعنت ملامت کرنے والا' فحش گوئی کرنے والا اور بداخلاق نہیں ہوسکتا۔''

اور میرے نزدیک اس ضمن میں حرفِ آخر ہے وہ حدیثِ مبارکہ جو متفق علیہ ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: ((وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ' وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ' وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ!)) ''خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے! دوسری مرتبہ پھر یہی فرمایا' تیسری مرتبہ پھر آپﷺ نے یہی فرمایا کہ خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے''۔ صحابہ کرامؓ لرز گئے ہوں گے کہ کون ہے وہ شقی شخص جس کے بارے میں حضورﷺ تین مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر فرما رہے ہیں کہ

(٤) سنن الترمذی' کتاب الرضاع' باب ما جاء فی حق المرأة علی زوجھا۔

(٥) سنن الترمذی' کتاب البر والصلة' باب ما جاء فی اللعنة۔ وشعب الایمان للبیھقی' الرابع والثلاثون من شعب الایمان' فصل فی فضل السکوت عن کل ما لا یعنیه ......

وہ شخص مؤمن نہیں۔ ((قِیلَ وَمَنْ یَا رَسُولَ اللّٰہِ ؟)) ''پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول کون؟'' تو جواب میں یہ ارشاد ہوتا ہے: ((اَلَّذِی لَا یَأْمَنُ جَارُہٗ بَوَایِقَہٗ))(٦) ''وہ شخص جس کی ایذا رسانی سے اس کا پڑوسی چین یا امن میں نہیں ہے''۔ یہ حدیث بہت سے افراد نے پہلے بھی سنی ہوگی' لیکن اس اعتبار سے توجہ کریں کہ یہاں کسی گناہِ کبیرہ کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ یہاں شرک کا تذکرہ نہیں ہے' زنا کا تذکرہ نہیں ہے' چوری' ڈاکہ یا قتل کا تذکرہ نہیں ہے' صرف وہ شے بیان فرمائی جس کو ہم کج خلقی کہتے ہیں۔

میں یہاں متکلمانہ بحثیں نہیں چھیڑنا چاہتا' ظاہر ہے کہ یہاں یہ بات مراد نہیں ہے کہ جس شخص کی یہ کیفیت ہے وہ اسلام کے دائرے سے نکل گیا' وہ کافر ہوگیا ـــــ بلکہ کوئی اور حقیقت ہے جس کی نفی محمد رسول اللہ ﷺ اس شدت سے فرما رہے ہیں۔ یہ قانونی ایمان نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی کو دنیا میں مسلمان سمجھا جاتا ہے' لیکن اسے حقیقت ایمان کہہ لیں یا ایمان کا تکمیلی درجہ کہہ لیں کہ اُس شخص کی محرومی پر رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ اللہ کی قسم کھائی ہے جس کی ایذا رسانی سے اُس کا پڑوسی چین میں نہیں ہے۔ اس موضوع پر آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ کا بہت سا ذخیرہ سامنے لایا جاسکتا ہے مگر میں اسی پر اکتفا کرتے ہوئے اب دوسری بات کی طرف آرہا ہوں۔

قرآن حکیم کی روشنی میں اخلاقیات کی فلسفیانہ اساس

علم اخلاق یا اخلاقیات کے ذیل میں قرآن حکیم کی اہم ترین تعلیم جو اخلاقیات کی فلسفیانہ اساس بنتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے نفس میں اللہ تعالیٰ نے نیکی و بدی کا شعور الہامی طور پر ودیعت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج اپنی گفتگو کا آغاز سورۃ الشمس کی ان آیات سے کیا ہے: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ⑦﴾ اور نفسِ انسانی کی قسم اور جیسا کچھ اللہ نے اس کو بنایا' سنوارا' اس کی نوک پلک درست کی۔ ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ⑧﴾ اور الہامی طور پر اس میں ودیعت کر دیا فجور اور تقویٰ کا علم' نیکی اور بدی کا شعور' خیر اور شر کا امتیاز' اِثم و بِرّ کے مابین تمیز۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں نیکی اور بدی کے لیے خیر اور شر کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں' اِثم و بِرّ کے الفاظ بھی آئے ہیں' لیکن جامع ترین اصطلاح ہے ''معروف'' اور ''منکر''۔ معروف کے لفظی معنی ہیں جو شے جانی پہچانی ہے' جبکہ منکر کہتے ہیں اُس شے کو جس کے بارے میں اجنبیت محسوس کی جائے' جس کو پہچانا نہ جارہا ہو۔ اس اعتبار سے قرآن مجید نیکی

اور بدی کے بارے میں یہ بنیادی تصور سامنے لاتا ہے۔ میں یہاں نفسِ انسانی کی اصطلاح استعمال کر رہا ہوں' کیونکہ آیاتِ مبارکہ میں ﴿وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝﴾ آیا ہے۔ نفسِ انسانی میں جو بھی ارتقائی عمل ہوا ہے اس کے نتیجے میں حیوانات کے مقابلے میں ایک بالکل نئی استعداد اور صلاحیت پیدا ہوئی ہے اور وہ ہے خیر اور شر میں امتیاز کی صلاحیت۔ انسان اپنی اس فطرت کے اعتبار سے جانتا ہے کہ کیا خیر ہے اور کیا شر ہے؟ کیا نیکی ہے اور کیا بدی؟ ''خیر'' اس کے لیے معروف کے درجے میں ہے' جبکہ شر' برائی' بدی اور اِثم کو وہ منکر سمجھتا ہے۔ یہ درحقیقت خیر اور شر (good and evil) کے بنیادی تصورات ہیں جو پوری نوعِ انسانی کا مشترک اثاثہ ہیں' ان میں آپ کو کہیں کوئی فرق معلوم نہیں ہوگا۔ سچ بولنا ہر معاشرے میں' ہر دور میں خیر قرار دیا گیا اور جھوٹ بولنا ہر معاشرے میں' ہر دور میں بدی قرار پایا۔ ایفائے عہد ہر دور میں' ہر معاشرے میں نیکی قرار پائی اور وعدہ خلافی ہر دور میں' ہر معاشرے میں ایک برائی سمجھی گئی۔

اس کا ذرا تقابل کریں دوسرے الفاظ کے ساتھ۔ ایک ہے شریعت کے احکام اور اوامر و نواہی کہ یہ فرض ہے' یہ واجب ہے اور یہ حرام ہے' اس کے قریب نہ پھٹکو۔ واضح رہے کہ یہ دوسری منزل ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے لیے انسان کو وحی اور نبوت کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ مثلاً شراب حرام ہے' اس کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ انسان طبعاً اس کا فیصلہ کر سکے' سؤر کا گوشت حرام ہے' اس کے بارے میں آج بھی لوگوں کو اشکال ہے کہ کیوں حرام ہے؟ یہ وہ چیزیں ہیں جو درحقیقت شریعت کے نقل پر مبنی ہیں۔ جو اللہ نے فرمایا اور جو اللہ کے رسول ﷺ نے ہم تک پہنچایا ہے ان احکام کی اطاعت ہمارے ذمے ہے' ان کی خلاف ورزی کو ہم معصیت قرار دیتے ہیں۔ جبکہ منکر کی اصطلاح اس سے وسیع تر مفہوم کی حامل ہے۔ یہ وہ پہلی منزل ہے جو اخلاقی اقدار (ethical values) پر مشتمل ہے۔ یہ اخلاقی اقدار پوری نوعِ انسانی کی مشترک متاع ہیں۔ ہر دور میں' تمام اقوام میں اور ہر علاقے میں ان کو مانا گیا ہے کہ یہ اچھائیاں ہیں' بھلائیاں ہیں' نیکیاں ہیں اور یہ برائیاں ہیں' یہ شر ہے اور یہ خیر ہے۔

اس اعتبار سے میں چاہتا ہوں کہ چند احادیث مبارکہ آپ کے سامنے رکھوں۔ بڑی پیاری حدیث ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: ((اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَائَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ)) (۷) ''اگر تمہیں کوئی اچھا کام کر کے خوشی ہو اور کوئی برا کام کر کے تمہیں خود ملال

(۷) مسند احمد بن حنبل' مسند العشرة المبشرين بالجنة' مسند الانصار' حديث ابى أمامة الباهلىّ الصدىّ......

تو تم مؤمن ہو''۔ یہ احساس گویا ایمان کی علامت ہے۔ معلوم ہوا کہ فطرت مسخ نہیں ہوئی' فطرت کے اندر خیر وشر کا امتیاز برقرار ہے۔ تبھی تو نیکی کر کے تمہیں مسرت ہوئی ہے' خوشی ہوئی ہے' اور کوئی کام اگر غلط ہو گیا ہے' کسی بدی کا ارتکاب ہو گیا ہے تو اس پر تمہیں خود گھٹن محسوس ہوئی ہے' تمہیں خود ضیق اور تنگی کا احساس ہوا ہے۔ یہ علامت ہے اس بات کی کہ فطرت صحیح صورت پر برقرار ہے' فطرت مسخ (pervert) نہیں ہوئی۔

اس سے بھی زیادہ حکیمانہ قول ہے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا جو بہت ہی اہم فلسفیانہ حقیقت پر مشتمل ہے: ((وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي نَفْسِكَ وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ)) (۸) ''گناہ وہ ہے جو تمہارے سینے میں کھٹکے اور تم اسے ناپسند کرو کہ وہ کام لوگوں کے علم میں آئے''۔ جیسا کہ سورۃ القیامۃ میں ''نفسِ لوّامہ'' کی قسم کھائی گئی ہے:

﴿لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝١ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝٢﴾

''نہیں! میں قسم کھاتا ہوں روزِ قیامت کی۔ اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی''۔

وہ ضمیرِ ملامت گر ہے کہ اگر ہم سے کسی برائی کا صدور ہو جاتا ہے تو ہمیں اس کی بنا پر اندر ہی اندر کوئی شے ملامت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ انگریزی میں اسے یوں تعبیر کرتے ہیں: My conscious is biting me'' یعنی ''میرا ضمیر مجھے کچو کے دے رہا ہے''۔ درحقیقت یہ اسی آیت مبارکہ کی ترجمانی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ ایک ہے انسان کا انفرادی ضمیر (individual conscious) جس پر مذکورہ بالا حدیث میں آنجناب ﷺ کی جانب سے گویا اظہارِ اعتماد کیا گیا ہے۔ یہ ضمیر ایک زندہ حقیقت ہے اور یہ علامت ہے اس بات کی کہ فطرتِ انسانی اپنی صحت پر برقرار ہے۔ آپ کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ میں یہ کام کر تو بیٹھا ہوں لیکن کسی کے علم میں نہیں آنا چاہیے۔ اس لیے کہ لوگ ملامت کریں گے' میرے بارے میں بری رائے قائم کریں گے۔ اسی طرح نوعِ انسانی کا ایک اجتماعی ضمیر (collective conscious) بھی ہے جس کا اثبات کیا جا رہا ہے۔ بہرحال احکامِ شریعت کے معاملے کو' جو ایک بلندتر منزل ہے' آج کی بحث سے خارج سمجھئے۔ لیکن جہاں تک انسانی اخلاقیات کا تعلق ہے تو ان چیزوں کے لیے انسان کسی تلقین یا تعلیم کا حاجت مند نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کی عطا ہے' یہ دولت اس کے پاس ہے۔

(۸) جامع الترمذی' کتاب الزھد' باب ما جاء فی البر والاثم۔

یہ پہچان' یہ فہم' یہ شعور' یہ امتیاز اس کے اندر ودیعت شدہ ہیں۔ لہٰذا صداقت و امانت ہو' ایفائے عہد ہو' صلہ رحمی ہو' خدمتِ خلق ہو' یہ وہ بنیادی اوصاف ہیں جو مجمع علیہ ہیں۔

ایک حدیث ملاحظہ کیجیے' حضرت انس رضی اللہ عنہ جو نو برس تک حضور ﷺ کے ذاتی خادم کی حیثیت سے آپؐ کے ساتھ رہے ہیں' ان کی گواہی ہے کہ: **قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلاَّ قَالَ :((لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ ' وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ))** (۹) ''شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہوگا کہ ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور اس میں یہ الفاظ نہ وارد ہوئے ہوں: ''جس شخص کے اندر امانت داری کا وصف نہیں ہے اس کا کوئی ایمان نہیں اور جس میں ایفائے عہد کا مادہ نہیں اس کا کوئی دین نہیں''۔ امن' امانت اور ایمان کا قریبی رشتہ ہے اور لفظی طور پر بھی ان کا ایک ہی مادہ ہے۔ ایفائے عہد کا دین سے جو معنوی ربط ہے اس کو سمجھ لیجیے' کہ درحقیقت دین بھی تو بندے اور رب کے درمیان ایک عہد ہے۔ نماز میں ہم عہد کرتے ہیں: **﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۝﴾** (سورۃ الفاتحہ) ''پروردگار! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے''۔ یہ ایک بڑا عہد ہے' جو شخص چھوٹے چھوٹے وعدے پورے نہ کرتا ہو وہ اتنا بڑا عہد' پوری زندگی کا عہد کیسے نبھائے گا؟ چنانچہ جس شخص میں امانت کا وصف نہیں اس میں ایمان نہیں' اور جس میں پاسِ عہد نہیں اس کا کوئی دین نہیں!!

اسی طرح خدمتِ خلق کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا یہ قول یاد کیجیے: **((خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسَ))** (۱۰) ''لوگوں میں بہترین وہی ہیں جو لوگوں کو فائدہ پہنچائیں۔''

یہ جو بنیادی اخلاقیات ہیں' مثلاً صداقت' امانت' ایفائے عہد' صلہ رحمی' خدمتِ خلق' کمزوروں پر رحم' غریبوں کی امداد' یتیموں اور مسکینوں کی سرپرستی' یہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۝۱ فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۝۲ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ۝۳﴾ (الماعون)

''کیا دیکھا آپ نے اُس شخص کو جو جھٹلاتا ہے بدلے کو؟ پس وہی ہے جو دھکے دیتا ہے

(۹) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ مشکوٰۃ المصابیح' کتاب الایمان' الفصل الثانی۔ ومسند احمد بن حنبل' باقی مسند المکثرین من الصحابۃ' مسند انس بن مالک۔

(۱۰) شعب الایمان للبیھقی' فصل فی ذکر ما ورد من التشدید......

یتیم کو' اور نہیں ترغیب دیتا مسکین کو کھانا کھلانے کی۔''

وہ چیزیں ہیں جو فطرتِ انسانی کی جانی پہچانی ہیں' معروفات ہیں۔ ہر انسان جانتا ہے کہ یہ
کی ہے اور اس کی ضد شر ہے۔

علیٰ اخلاق کے لیے جذبۂ محرکہ

یہاں تک تو سب جانتے ہیں' مگر عملاً جو مسئلہ درپیش ہے اس کا اظہار غالبؔ نے اس شعر
ں کیا ہے ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

سی طرح فارسی کا ایک بہت تلخ شعر ہے' جو گزشتہ خطاب میں بھی بیان ہو چکا ہے ؎

اے دیانت بر تو لعنت از تو رنجے یافتم
اے خیانت بر تو رحمت از تو گنجے یافتم (۱۱)

یک شخص جانتا ہے کہ سچ بولنا خیر ہے' مگر سچ بولنے سے نقصان ہو رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جھوٹ
ولنا شر ہے' لیکن جھوٹ بول کر لاکھوں کا نفع حاصل ہو رہا ہے۔ اب وہ کون سی قوتِ محرکہ
(motivating force) ہوگی اور وہ کون سا جذبۂ محرکہ ہوگا جو اسے آمادہ کرے گا کہ سچ
ولنا ہے' چاہے جان بھی جانے کا اندیشہ ہو' چاہے اس کی وجہ سے نقصان ہو جائے۔ یہ ہے اصل
سئلہ علم الاخلاق کا' ورنہ جہاں تک بنیادی نیکی کا تصور ہے' انسان اندھا بہرا نہیں ہے۔ بلکہ
للہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو خارجی سماعت و بصارت عطا فرمائی ہے اسی طرح نفسِ انسانی
و باطنی بصیرت عطا فرمائی ہے کہ کیا خیر ہے' کیا شر ہے' کیا نیکی ہے' کیا بدی ہے! یہ جو جذبہ محرکہ
ہے اس کے بارے میں بعض نظریات دنیا میں رائج ہیں۔ خاص طور پر جدید مغربی دنیا میں
سفرز نے اخلاقیات کی جو اساسات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے' واقعہ یہ ہے کہ یہ اساسات
کل ریت کی دیوار کی مانند ہیں' جن کے لیے کوئی استحکام نہیں۔ ہم یہاں ان کا مختصر تعارف
ں کر رہے ہیں۔

) نظریۂ مسرت: یعنی نیکی سے خوشی ہوتی ہے' اچھے اخلاق سے انشراح ہوتا ہے۔ اس کی

---

۱) اے دیانت تجھ پر لعنت ہو' تجھ سے میں نے سوائے رنج کے کچھ نہ پایا۔ اے خیانت تجھ پر
رحمت ہو' تیری وجہ سے میں نے خزانہ حاصل کیا!!

جزوی صداقت میں خود نبی اکرم ﷺ کی احادیث کی روشنی میں بیان کر چکا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ مسرت اخلاقیات کی مستقل اور مستحکم اساس بن سکتی ہے؟ جب کہ سوال ہوگا کہ مسرت کس کی؟ ہوسکتا ہے ایک آدمی کی مسرت دوسرے آدمی کی مسرت سے ٹکرا رہی ہو۔ اسی طرح مسرت اور تلذّذ (sensual gratification) میں بڑا باریک سا پردہ رہ جاتا ہے۔ وہ جو کہا گیا ہے ع ''مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد'' (ہمت اور بے ہمتی میں ایک قدم کا فاصلہ ہے)۔ جس طرح فکر' سوچ اور روحانی مسرت کا یقیناً اخلاق کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے اسی طرح دنیا جانتی ہے کہ بہت سے لوگ ہیں جن کی شخصیتیں مسخ ہوجاتی ہیں' انہیں دوسروں کو اذیت پہنچا کر مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اذیت پسند لوگ (sadist) دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مسرت اعلیٰ اخلاق کی کوئی بنیاد نہیں بن سکتی' کیونکہ یہ کوئی پائیدار قوتِ محرکہ نہیں ہے۔

(ب) نظریۂ منفعت: ایک دوسرا فلسفہ ہے ''منفعت''۔ انگریزی کی مشہور کہاوت ہے: Honesty is the best Policy —— یقیناً جزوی اعتبار سے یہ بات درست بھی ہے۔ کاروبار میں اگر ایک شخص دیانت اور صداقت کا معاملہ کر رہا ہے تو اس کی ساکھ بن جائے گی' لوگ اس پر اعتماد کرنے لگیں گے' وہ ایک کامیاب تاجر ثابت ہوگا' اس کی صداقت و امانت دنیا میں بھی اس کے لیے نافع ہوجائے گی۔ جزوی اعتبار سے یہ بات صحیح ہے' لیکن اسی کو آگے بڑھایئے تو ایک کی منفعت دوسرے کی مضرت بھی بن جاتی ہے۔ ایک کا نفع دوسرے کے لیے نقصان بنتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ کوئی مستقل اصول نہیں ہے۔

(ج) نظریۂ اجتماعی منفعت: ایک اور تصور دنیا میں دیا گیا ہے ''اجتماعی منفعت'' کا کہ اگر کسی شخص کا تعلق کسی اجتماعیت سے ہے اور اس کے دل میں اس اجتماعیت کے لیے' مثلاً اپنی برادری (community)' اپنی قوم یا اپنے وطن کے لیے اگر سچی محبت کا جذبہ ہے تو یہ بھی اخلاق کی بنیاد بنتی ہے۔ میں یہاں بھی تسلیم کروں گا کہ جزوی طور پر یہ بات صحیح ہے کہ قوم پرست اور وطن پرست انسان اپنی قوم اور وطن کے لیے ایک اچھا انسان ہوگا' ان کو دھوکہ نہیں دے گا' ان سے فریب نہیں کرے گا۔ یہاں پر میرا ذہن منتقل ہوا ہے نبی اکرم ﷺ کے خطبات میں سے ایک بہت ہی ابتدائی دور کے خطبے کی جانب جسے ''نہج البلاغہ'' کے مرتبین نے بھی شامل کیا ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ نے اسی بنیاد کو ایک دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے۔

((اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکْذِبُ اَھْلَہٗ ، وَاللّٰہِ لَوْ کَذَبْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا کَذَبْتُکُمْ ،

وَلَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ مَا غَرَرْتُكُمْ، وَاللّٰهِ الَّذِی لا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، اِنِّی لَرَسُولُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ خَاصَّةً وَاِلَى النَّاسِ كَافَّةً ، وَاللّٰهِ لَتَمُوتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ ، وَلَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ ، وَلَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ، وَلَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوءِ سُوءًا ، وَاِنَّهَا لَلْجَنَّةُ اَبَدًا اَوِ النَّارُ اَبَدًا))(۱۲)

”بے شک راستہ دکھانے والا اپنے قافلے والوں کو دھوکہ نہیں دیتا۔ اور خدا کی قسم! اگر میں بالفرض تمام لوگوں سے جھوٹ بول سکتا تو بھی تم سے جھوٹ نہ بولتا' اور اگر بالفرض تمام نوعِ انسانی کو دھوکہ دے سکتا تو بھی تمہیں دھوکہ نہ دیتا۔ پس اللہ کی قسم' جس کے سوا کوئی معبود نہیں' بلاشبہ میں تمہاری جانب رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں خصوصیت کے ساتھ اور تمام نوعِ انسانی کی جانب عمومیت کے ساتھ۔ اللہ کی قسم' بلاشبہ تم سب مر جاؤ گے جیسے سو جاتے ہو' اور بلاشبہ تم سب اٹھائے جاؤ گے جیسے نیند سے بیدار ہوتے ہو۔ اور ضرور بالضرور تم سب سے حساب ہو کر رہے گا اُس کے بارے میں جو تم عمل کرتے رہے' اور ضرور تمہیں بدلہ دیا جائے گا نیکی کا اچھا بدلہ اور برائی کا برا بدلہ۔ وہ یا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت ہے یا ہمیشہ ہمیشہ کی آگ۔“

یہ ایک چھوٹا سا خطبہ ہے' لیکن بہت جامع ہے۔ میں اس کا حوالہ اس لیے دے رہا ہوں کہ آج دنیا میں ہمارے سامنے یہ بات ایک حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ آپ انگلستان یا امریکہ جاتے ہیں وہاں وقت کی پابندی ہوتی ہے۔ کوئی شخص چین کا دورہ کر کے آتا ہے' وہ کہتا ہے کہ اصل اسلام تو وہاں ہے' لوگوں کے اخلاق و کردار' وہاں کا نظم وضبط' لوگوں کا صاف معاملہ کرنا' دھوکہ نہ دینا' فریب سے کام نہ لینا۔ واقعہ یہ ہے کہ قوم پرستی' وطن پرستی (Nationalism) اور اس سے آگے بڑھ کر انسان دوستی (Humanism) ایک نظریے کے ساتھ وابستگی (Idealism)' یہ چیزیں یقیناً انسان کے اندر اخلاقِ حسنہ کی ترویج اور خارج میں تنفیذ کے لیے مفید ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں بھی یہ بات سامنے آئے گی کہ اس کی وسعت (scope) تو بہت محدود (limited) ہے۔ اس لیے کہ ہمارا مشاہدہ ہے اور پوری دنیا جانتی ہے کہ جو لوگ اپنی قوم کے لیے نہایت رحم دل' نہایت سچے' دھوکہ نہ دینے والے' کاروبار میں راست باز ہوتے ہیں یہی لوگ دوسری قوموں کا خون چوسنا روا سمجھتے ہیں۔ یہی مہذب قومیں جب بین الاقوامی سطح پر آتی ہیں تو ان سے بڑا جھوٹا' ان سے بڑا دھوکے باز' ان سے بڑا ظالم اور کوئی نہیں ہوتا۔ یہ لوگ

(۱۲) انساب الاشراف للبلاذری' دعاء رسول اللہ ﷺ۔ فقہ السیرۃ للالبانی: ۹۷۔

پوری پوری قوموں کو بیچ کھائیں گے ع ''قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند'' (پوری قوم کو بیچ دیا اور کس قدر رستا بیچ دیا!) ہندوستان میں ایک ایک شخص کے بدلے پوری پوری آبادیاں تہس نہس کر دی گئیں۔ ایک انگریز کے قتل کا انتقام لینے کے لیے پوری پوری بستیاں تباہ و برباد کر دی گئیں۔ نہ انہیں معاہدوں کی پرواہ ہوتی ہے نہ بین الاقوامی قراردادوں کی' وہ صرف اپنے مفادات کو دیکھتے ہیں۔ خاص طور پر انگریزوں نے عرب قوم سے جو وعدے کیے تھے اور انہیں جو فریب دیا تھا' جس کی وجہ سے عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی تھی' پہلی جنگِ عظیم کے دوران ان وعدوں کا کیا ہوا؟ وہ سارے وعدے ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئے۔ تو یہ نظریہ بھی اخلاقیات کی ایک بنیاد تو ہے لیکن اس کی محدودیت (limitation) ظاہر ہو رہی ہے۔

اصل جذبہ محرکہ ''ایمان''

ایک ایسا جذبہ محرکہ' ایک ایسی motivation جو کہیں ناکام نہ ہو' ہر سطح پر انسان کو خیر اور بھلائی کے لیے کھڑا رکھے اور اس میں استقامت پیدا کرے' کہیں بھی جا کر اس کی صداقت اور امانت میں ضعف پیدا نہ ہو' اس کی مثال ہمارے سامنے آتی ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے شام کا ایک شہر فتح کیا تو وہاں کے لوگوں سے جزیہ وصول کر لیا' لیکن جنگی صورتحال ایسی ہوئی کہ انہیں پسپائی اختیار کرنی پڑی' محسوس ہو رہا تھا کہ دشمن ہمیں گھیرے میں لے رہا ہے۔ اس صورت حال میں انہوں نے شہر کے لوگوں کو بلا کر ان کی جزیے کی رقم واپس کر دی۔ یہ جو اخلاق کا مرتبہ ہے جس میں کسی سطح پر جا کر بھی پستی دکھائی نہیں دیتی' یہ درحقیقت صرف اور صرف ایمان کے ذریعے ممکن ہے۔ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ اصل میں وہ جذبہ محرکہ ہے جو قرآن ہمیں عطا فرماتا ہے۔

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ' دونوں میں مثبت اور منفی پہلو موجود ہیں۔ ایک طرف اللہ کی محبت' اللہ کی رضا جوئی اور دوسری طرف اللہ کا خوف' تقویٰ' یہ احساس کہ اللہ ہم سے ناراض نہ ہو جائے' درحقیقت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ہم تقویٰ کا ترجمہ صرف خوف سے کر دیتے ہیں تو اس میں ایک محدودیت آ جاتی ہے۔ اصل مثبت جذبہ محبت کا ہے۔ جیسے ایک سعادت مند بیٹا یہ محسوس کرتا ہے کہ میرے والد ناراض نہ ہو جائیں' کہیں میں اپنے والد کے احساسات کو ٹھیس نہ پہنچا دوں' ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے ان کی دل شکنی ہو' اس وجہ سے اگر وہ اپنے والد کی اطاعت کر رہا ہے اور جو چیزیں انہیں پسند ہیں ان کا اہتمام کر رہا ہے' تو یہ تقویٰ کی

اصل حقیقت ہے۔

ایمان باللہ کی حقیقت یوں سمجھئے کہ انسان نے عُروۃُ الوُثقٰی (مضبوط کنڈا) تھام لیا۔ اب بڑے سے بڑے امتحان میں اس کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئے گی۔ دوسرا ایمان بالآخرۃ ہے۔ مَیں صرف وضاحت کے لیے عرض کر رہا ہوں کہ اس میں سلبی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ یعنی آخرت کا خوف' آخرت کی جواب دہی کا احساس کہ ہر سانس کے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے۔ اس کے لیے انسان اگر شعور تازہ رکھے تو یقیناً وہ ہر قدم پر اپنا محاسبہ کرے گا کہ کہیں مجھ سے کوئی غلط حرکت تو نہیں سرزد ہوگئی اور ہوشیار رہے گا کہ کہیں مجھ سے کوئی غلط فعل نہ سرزد ہو جائے۔

ایمان بالآخرہ کے ضمن میں سورۃ العلق کی تین آیات کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انبیاء کرام ﷺ بھی غور وفکر کے مراحل سے گزرتے ہیں۔ جیسے وحی کے آغاز سے قبل نبی اکرم ﷺ کا غارِ حرا کا دور ہے۔ اس کے بارے میں شارحین نے وضاحت کی ہے کہ كان صفة تعبّده فی غار حراء التفكّر والاعتبار[۱۳] (غارِ حرا میں نبی اکرم ﷺ کی عبادت کی کیفیت تفکر و اعتبار پر مبنی تھی)۔ غور وفکر اور سوچ بچار ایک تو فلسفیانہ مسائل پر ہے اور ایک اپنے گرد و پیش کے حالات پر ہے۔ سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات کی حیثیت تو سب سے پہلی وحی کی ہے' لیکن اس کے بعد جو تین آیات آئی ہیں ان کے پسِ منظر میں نبی اکرم ﷺ کے غور وفکر کا جواب ملتا نظر آتا ہے کہ ایک حسّاس انسان جس کی اپنی اخلاقی حس انتہائی بیدار ہے' وہ معاشرے میں دیکھتا ہے کہ ظلم وتعدّی ہے' حق تلفیاں ہو رہی ہیں' لوگوں پر جبر ہو رہا ہے' جھوٹ بولا جا رہا ہے' عزتیں اور حرمتیں پامال ہو رہی ہیں۔ خاص طور پر عرب کے اُس معاشرے کا تصور کریں کہ اخلاقی اعتبار سے وہ معاشرہ کس سطح پر پہنچا ہوا تھا' اس میں نبی اکرم ﷺ غور وفکر فرما رہے ہیں کہ اس ظلم کا ازالہ کیسے ہو؟ انسان طرح طرح کے دکھوں' مصائب اور رنج و آلام میں مبتلا ہے۔ اس سے نجات (salvation) کا کوئی راستہ ہے یا نہیں؟ اس طرح ان آیات کے پس منظر میں ایک گہرا فکر معلوم ہوتا ہے جس میں رہنمائی دی جا رہی ہے۔ جیسا کہ

---

(۱۳) اس قول کا تلاش کے باوجود کوئی حوالہ دستیاب نہ ہو سکا۔ انبیاء علیہم السلام کے غور وفکر کے مراحل سے گزرنے کے حوالے سے مختلف آراء رہی ہیں۔ البتہ یہ بات سب کے ہاں مسلّم ہے کہ منصبِ نبوت وہبی تھا نہ کہ کسبی! (مرتب)

حضرت عزیر علیہ السلام نے بیت المقدس کو اس حالت میں دیکھ کر فرمایا تھا کہ ایک اینٹ سلامت نہیں رہی' کوئی متنفس موجود نہیں' بستی اُجڑی ہوئی ہے۔

﴿اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۹)

''اللہ اس بستی کو اس تباہی کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟''

ایسے ہی اس معاشرے کا معاملہ تھا جو اخلاق کی انتہائی پستی تک پہنچ گیا تھا۔ اب یہ اس قعرِ مذلّت سے کیسے نکلے گا؟ یہ فکر ہے' یہ سوچ ہے!

اس پس منظر میں ان تین آیات پر غور کیجیے' فرمایا: ﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ ۝﴾ ''نہیں! انسان سرکشی پر اتر آتا ہے''۔ دست درازی پر آمادہ ہو جاتا ہے' اپنے حدود سے متجاوز ہو جاتا ہے۔ آپؐ کا یہ مشاہدہ صحیح ہے' معاشرے میں ظلم ہے' حق تلفی ہے' ناانصافی ہے' جبر ہے' discrimination ہے' اعلیٰ اور ادنیٰ کی تقسیم ہے۔ پھر یہ کہ جھوٹ بولا جا رہا ہے' حق داروں کی حق تلفی کی جا رہی ہے۔ مشاہدہ تو یقیناً درست ہے۔ آگے فرمایا: ﴿اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝﴾ ''سبب یہ ہے کہ انسان دیکھتا ہے اپنے تئیں کہ مستغنی ہے''۔ کہیں پکڑ نہیں ہو رہی۔ اگر کوئی انگارا ہاتھ میں لیا جائے تو ہاتھ جل جاتا ہے' مگر جھوٹ بولا جائے تو کچھ نہیں ہوتا' زبان پر چھالا تک نہیں پڑتا۔ اگر زہر کھا لیا جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے' لیکن یتیم کا مال ہڑپ کر لیا جاتا ہے' حقداروں کا حق ہڑپ کر لیا جاتا ہے مگر کچھ نہیں ہوتا' پیٹ درد تک نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ ایک اعتبار سے تو یہ دنیا مکمل ہے کہ مادی قانون اپنے نتائج پیدا کر رہا ہے' لیکن اخلاقی قانون یہاں نتائج پیدا نہیں کر رہا بلکہ بسا اوقات غلط نتیجہ نکلتا ہے۔ حرام خوری کرنے والے عیش کر رہے ہیں' ظلم کرنے والے اقتدار کی مسندوں پر بیٹھے ہیں' جن لوگوں نے حقوق سے دوسروں کو محروم کیا وہی ہیں کہ جن کی چودھراہٹیں ہیں' انہیں معاشرے میں عزت مل رہی ہے۔ پھر فرمایا: ﴿اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝﴾ ''یقیناً تیرے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے''۔ اس کا علاج ایک ہی ہے کہ انسان کے سامنے یہ حقیقت موجود اور مستحضر رہے کہ اسے اس زندگی میں فوری پکڑا نہیں جا رہا' فوری سزا نہیں مل رہی' لیکن یہ جو اللہ کی طرف رجوع ہے ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ — تو وہاں اصل آخرت کا محاسبہ ہے' جواب طلبی ہے۔ یہ ہے اصل شے کہ اگر یہ یقین دل میں قائم ہو جائے تو پھر کیسا ظلم؟ کیسی تعدّی؟ کیسی ناانصافی؟ کیسے کوئی جھوٹ بولے گا' کیسے کوئی فریب دے گا' اگر یہ احساس ہو کہ ایک ایک عمل' ایک ایک قول

کی جواب دہی کرنی ہے!

واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے اخلاق و اعمال کی درستی کے لیے ایک تو آخرت کی فکر کو' آخرت کے یقین کو' جواب دہی کے احساس (The Grand Accountibility) کو اور دوسرے اللہ تعالیٰ کی محبت کو بنیاد بنایا ہے۔ اور یہ محبت دوطرفہ ہے۔ اللہ بندوں سے محبت کرتا ہے اور بندوں سے چاہا گیا ہے کہ اللہ سے محبت کریں۔ یہ دوسرا پہلو میں بعد میں بیان کروں گا' پہلے یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا اپنی محبت کا کس قدر ترغیب وتشویق کے انداز میں مثبت اور منفی پہلوؤں سے ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴿۱۹۵﴾﴾ (البقرۃ) ''بے شک اللہ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے''۔ احسان کا تذکرہ دونوں معنوں میں ہوتا ہے' ایک یہ کہ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنا اور دوسرے یہ کہ ''احسان'' مراتبِ دینیہ میں سے ایک اعلیٰ مرتبہ بھی ہے جو کہ ہماری گفتگو کے دوسرے حصے یعنی ''اسلام کے روحانی نظام'' سے متعلق ہے۔ اسی طرح دیگر مقامات پر ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۴﴾﴾(التوبۃ) ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴿۲۲۲﴾﴾(البقرۃ) ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ﴿۱۴۶﴾﴾ (آل عمران) ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴿۱۵۹﴾﴾(آل عمران) ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴿۹﴾﴾(الحجرات) یعنی اللہ کو محبوب ہیں جو تقویٰ کی روش اختیار کرنے والے ہیں' توبہ کرنے والے اور ہر طرح کی طہارت و پاکیزگی کا اہتمام کرنے والے ہیں' صبر کرنے والے ہیں' توکل کرنے والے ہیں' عدل وانصاف پر کاربند ہیں —— اور اس کی سب سے اونچی چوٹی یہ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴿۴﴾﴾ (الصفّ)

''اللہ محبت کرتا ہے ان بندوں سے جو جنگ کرتے ہیں اس کی راہ میں ایسے کہ جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''

اس میں درحقیقت سب سے بڑی تحریض اور motivation ہے کہ یہ وہ چیز ہے جو کہیں بھی جا کر ختم نہیں ہوگی' کبھی بھی انسان کا ساتھ نہیں چھوڑے گی' ہر لحظہ' ہر لمحہ' ہر منزل' ہر مرحلے پر یہ انسان کے ساتھ رہے گی۔ یہ ہے اللہ کی محبت اور اللہ کی رضا جوئی کا جذبہ اور محاسبۂ اخروی کا احساس۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ﴿٤١﴾﴾ (النّٰزِعٰت)

''اور جو شخص (دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا' تو یقیناً جنت اُس کا ٹھکانا ہوگی۔''

یہ ہے وہ ایمان کا جذبۂ محرکہ جو قرآن اور سنتِ رسول ﷺ ہمیں فراہم کرتے ہیں۔ باقی جہاں تک بنیادی انسانی اخلاقیات کا تعلق ہے ان کے ضمن میں قرآن مجید نے خود ہمیں یہ ہدایات دی ہیں کہ وہ سب انسانوں کے نزدیک جانی پہچانی حقیقتیں ہیں اور ان کے لیے انسان کسی تعلیم کا محتاج نہیں۔ ان دو باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے لیے سیرت و کردار کی تعمیر اور تہذیب اخلاق کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ ایمان کی گہرائی اور گیرائی کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے' قلب میں ان کے تخم کی آبیاری ہو اور اس کی افزائش کا اہتمام کیا جائے' اس میں اضافے کی کوشش کی جائے۔ اسی کا نام درحقیقت معرفت ہے۔ سورۃ الذاریات میں فرمایا:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾﴾

''اور نہیں پیدا کیا میں نے جنوں اور انسانوں کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

بہت سے حضرات نے اس کی جو تعبیر کی ہے وہ یہ ہے کہ اِلَّا لِيَعْرِفُوْنِ[14] (مگر اس لیے کہ وہ میری معرفت حاصل کریں) اگر اللہ کی معرفت حاصل ہوگی' اللہ کی ہستی کا یقین ہوگا' اللہ سے ملاقات کا یقین اور امید ہوگی تو انسان کے اخلاق میں عظیم تبدیلی رونما ہو جائے گی۔ قرآن مجید اس حقیقت کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے۔ سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿٢١﴾﴾

''اور کہتے ہیں وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے' کیوں نہیں آتے ہمارے پاس فرشتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں؟ تحقیق یہ لوگ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں اور یہ لوگ حد (انسانیت) سے بہت دُور نکل گئے ہیں۔''

جب اللہ سے ملاقات کی امید نہیں رہی تو اب نیکی کی اساس کہاں رہی؟ نیکی کا اگر شعور بھی ہے

---

(۱۴) امام تفسیر' حضرت مجاہدؒ سے یہ تفسیر منقول ہے۔ تفسیر بحر المحیط لابی حیان' سورۃ الذاریات۔

تو اس پر کاربند ہونے کا جذبہ کہاں سے لائیں گے؟ ہاں اللہ کی معرفت' اللہ کی محبت' اللہ کا شوقِ لِقاءُ اللہ کے حضور میں حاضری اور اس کے سامنے جوابدہی کا خوف اور اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اس سے ملاقات کا اشتیاق اگر موجود ہے تو یہ ہے وہ چیز کہ بڑے سے بڑا نقصان ہو جائے لیکن انسان سچ پر' صداقت پر' امانت پر کاربند رہے گا۔ بڑی سے بڑی تکلیف آ جائے' انسان اس سے کسی جھوٹ کے ذریعے بچنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

اس ضمن میں آخری بات یہ عرض کروں گا کہ ایمان کو تر و تازہ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نماز جیسی عظیم ترین عبادت عطا فرمائی ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِكْرِیْ۝۱۴﴾ (طٰہٰ) ''اور قائم رکھو نماز کو میری یاد کے لیے''۔ اور یہ بھی نوٹ کیجیے' سورۂ طٰہٰ میں یہ بات پہلے تو مثبت انداز میں آئی۔ اسی سلسلۂ خطاب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو چل رہی ہے' انہوں نے عرض کیا: ''پروردگار! میرا سینہ کھول دے' اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے' اور میری زبان کی گرہ بھی کھول دے' تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔ نیز میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا ساتھی بنا دے......'' جب یہ درخواست منظور ہو گئی تو پھر دوبارہ حکم دیا گیا: ﴿وَلَا تَنِیَا فِیْ ذِكْرِیْ۝۴۲﴾ (طٰہٰ) ''دیکھنا میری یاد میں تساہل سے کام نہ لینا''۔ ﴿اِذْهَبَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۝۴۳﴾ (طٰہٰ) ''جاؤ تم دونوں فرعون کی طرف' وہ سرکشی پر اُتر آیا ہے۔'' اقامتِ صلوٰۃ کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے تاکہ ایمان کا شعور بیدار ہوتا رہے۔ اس پر جو ماحول کے اثرات پڑتے رہتے ہیں وہ صاف ہوتے رہیں۔ جیسے اگر کہیں برفباری ہو رہی ہو تو بار بار ضرورت پڑتی ہے کہ جو بھی برف کے گالے پڑے ہیں ان کو صاف کیا جائے۔ اسی طرح سے انسان پر جو ماحول کے اثرات مرتب ہوتے ہیں' جو حجابات طاری ہوتے ہیں' ان کو دور کرنے کے لیے نماز کا حکم دیا گیا۔ اس کے ساتھ جو دوسری عبادات ہیں ان کا تذکرہ دوسرے نمبر پر کروں گا' لیکن یہاں پر نماز کا تذکرہ اس اعتبار سے ہو گیا کہ ایمان ہی ہماری اصل قوتِ محرکہ (motivating force) ہے اور اس کی آبیاری کو مستحکم رکھنے کا بہترین طریقہ نماز ہے۔ اس حوالے سے مجھے حفیظ جالندھری کا یہ شعر بہت پسند ہے: ؎

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

ہمارا جو نفسِ عبدیت ہے یہ ماحول کے اثرات سے کچھ غبار آلود ہو جاتا ہے' اس کے اندر استکبار

اور سرکشی کے جذبات سر اٹھاتے ہیں' جن کی اصلاح کے لیے نماز بہترین عمل ہے۔ یہ گویا تجدیدِ ایمان کا ایک ذریعہ ہے۔

اب میں اپنے موضوع کے دوسرے حصے کی طرف آ رہا ہوں اور وہ ہے ''اسلام کا روحانی نظام''۔

(جاری ہے)

بقیہ: بیان القرآن

یعنی بھائی کو بہن سے دوگنا ملے گا۔ البتہ یہ بات اہم ہے کہ آیت ۱۲ میں جو حکم دیا گیا تھا وہ اَخیافی بہن بھائیوں کے بارے میں تھا۔ یعنی ایسے بہن بھائی جن کی ماں ایک ہو اور باپ علیحدہ علیحدہ ہوں۔ اُس زمانے کے عرب معاشرے میں تعدّدِ ازواج کے عام رواج کی وجہ سے ایسے مسائل معمولات کا حصہ تھے۔ باقی عینی یا علاتی بہن بھائیوں (جن کے ماں اور باپ ایک ہی ہوں یا مائیں الگ الگ ہوں اور باپ ایک ہی ہو) کا وہی عام قانون ہوگا جو بیٹے اور بیٹی کا ہے۔ جس نسبت سے بیٹے اور بیٹی میں وراثت تقسیم ہوتی ہے ایسے ہی ان بہن بھائیوں میں ہوگی۔

﴿يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ١٧٦﴾ ''اللہ واضح کیے دیتا ہے تمہارے لیے مبادا کہ تم گمراہ ہو جاؤ' اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

تعارفِ قرآن کے دوران میں نے بتایا تھا کہ قرآن حکیم کی ایک تقسیم سات احزاب یا منزلوں کی ہے۔ اس اعتبار سے سورۃ النساء پر پہلی منزل ختم ہوگئی ہے۔ **فَالحَمد لله علٰی ذٰلك!**

❀❀❀

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

قِتال فِی سَبِیل اللہ

سیرتِ نبوی ﷺ کے آئینہ میں

انجینئر نوید احمد

بانیٔ تنظیمِ اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی تصنیف ''منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ'' میں بڑی وضاحت سے وہ چھ مراحل بیان کیے ہیں جن سے گزر کر نبی اکرم ﷺ نے تاریخِ انسانی کا عظیم ترین اور انتہائی ہمہ گیر انقلاب برپا فرمایا۔ اِن مراحل میں دعوت' تنظیم' تربیت' صبرِ محض' اقدام اور مسلّح تصادم یعنی قتال فی سبیل اللہ شامل ہیں۔ دورِ نبوی ﷺ سے اگر موازنہ کریں تو قتال فی سبیل اللہ کے حوالے سے دورِ حاضر میں دو مشکلات پیدا ہو چکی ہیں:

(i) نظامِ باطل کے محافظ کلمہ گو مسلمان ہیں۔ ایک مسلمان کی جان کے احترام پر قرآن وحدیث میں انتہائی زور دیا گیا ہے۔

(ii) نظامِ باطل کے محافظین اور انقلابی تحریک کے کارکنوں کے درمیان عسکری تربیت اور وسائل واسباب کے اعتبار سے بہت بڑا فرق واقع ہو چکا ہے۔

مسلمان حکمرانوں کے خلاف خروج یعنی مسلّح جدّوجُہد کے حوالے سے فقہاء میں اختلاف ہے۔ دورِ خلافتِ راشدہ کے بعد جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوئی تو نظامِ حکومت کی اصلاح کے لیے خروج کی مثالیں سامنے آئیں۔ اِن مثالوں میں نمایاں ترین مثالیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی ہیں۔ واقعۂ کربلا اور واقعۂ حرّہ میں افسوسناک جانی نقصان ہوا اور مقاماتِ مقدّسہ کی حرمت بھی پامال ہوئی لیکن نظامِ حکومت ملوکیت ہی کا رہا۔ اب فقہاء میں مسلمان حکمرانوں کے خلاف خروج کے حوالے سے اختلافِ رائے سامنے آیا۔ بعض نے اِسے ناجائز قرار دیا اور بعض نے چند شرائط کے ساتھ اِس کے جواز کے حق میں رائے دی۔

تنظیمِ اسلامی اُن فقہاء کی رائے سے اتفاق نہیں کرتی جو مسلمان حکمرانوں کے خلاف

خروج کو جائز قرار نہیں دیتے۔ ہمیں اُن فقہاء کی رائے سے اتفاق ہے جو ایسے مسلمان حکمرانوں کے خلاف جو شریعت کے واضح احکامات کے برعکس قوانین نافذ کر رہے ہوں' خروج کو جائز قرار دیتے ہیں۔ البتہ اُن کے نزدیک خروج کے لیے ضروری ہے کہ اتنی قوت فراہم کرلی جائے کہ کامیابی کا واضح امکان ہو۔ اِس حوالے سے تنظیم اسلامی سمجھتی ہے کہ عسکری جدوجہد قابل عمل (feasible) نہیں' یعنی اِس کے ذریعے نظامِ باطل کے خلاف کامیابی کا امکان بحالاتِ موجودہ نظر نہیں آتا۔ اِسی لیے تنظیم اسلامی نے متبادل کے طور پر آخری مرحلہ کے لیے پُرامن لیکن منظم ایجی ٹیشن کا طریق کار پیش کیا ہے۔

پُرامن ایجی ٹیشن کے طریقِ کار کے حوالے سے دو اشکالات بیان کیے جاتے ہیں:

(i) سنت کے مطابق جب آخری مرحلہ قتال فی سبیل اللہ کا ہے تو تنظیم اسلامی پُرامن ایجی ٹیشن کا طریق کار کیوں پیش کر رہی ہے؟

(ii) ہمیں فی الحال آخری مرحلہ کے حوالے سے کوئی طریق کار پیش ہی نہیں کرنا چاہیے۔ اِس کی وجہ سے مذکورہ بالا اشکال پیدا ہوتا ہے۔ ابھی تو پہلے چار مراحل ہی پر عمل ہو رہا ہے۔ جب آخری دو مراحل کا وقت آئے گا اُس وقت دیکھا جائے گا۔

جہاں تک دوسرے اشکال کا تعلق ہے وہ بظاہر منطقی اور درست محسوس ہوتا ہے۔ البتہ اکثر رفقاء واحباب یہ سوال پوچھتے ہیں کہ آیا بحالاتِ موجودہ غلبۂ دین کی منزل تک پہنچنے کا کوئی امکان بھی ہے یا نہیں؟ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی تحریک کے لیے اپنی منزل تک پہنچنے کے تمام مراحل کو بیان نہ کرنا نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ تحریک کسی بھی وقت غلط موڑ مڑ سکتی ہے۔ جماعتِ اسلامی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اُنہوں نے آخری مرحلہ واضح نہیں کیا۔ لہٰذا انتخابی سیاست کا طریق کار اختیار کیا اور ٹھیٹھ اسلامی تحریک ایک اسلام پسند سیاسی جماعت میں تبدیل ہوگئی۔

پہلے اشکال کا ازالہ

پہلے اشکال کے ازالہ کے لیے چند گزارشات پیش خدمت ہیں :

(۱) بلاشبہ قتال فی سبیل اللہ دین اسلام میں' عمل کے اعتبار سے بلند ترین عمل ہے۔ قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبویہ ﷺ میں بار بار اِس عمل کو اللہ کا محبوب ترین عمل قرار دیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے انقلاب کے آخری مرحلہ کے طور پر اسی عمل کو اختیار کیا' لیکن آپ ﷺ نے یہ عمل آخری حل یعنی last option کے درجہ میں اختیار کیا۔ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا منشاء

دنیا میں خون ریزی کرنا یا لوگوں کو ہلاک کرنا نہیں تھا بلکہ اُنہیں ہدایت دینا اور راہِ راست پر لانا تھا۔ مشرکین' اہل کتاب اور منافقین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حسبِ ذیل فرامین پر غور کیجیے۔ غزوۂ بدر کے بعد مشرکین سے کہا گیا:

﴿قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿٣٨﴾﴾ (الانفال)

''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے اُن لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا اگر وہ اب بھی باز آجائیں تو انہیں معاف کردیا جائے گا جو بھی اُنہوں نے اِس سے پہلے کیا' لیکن اگر اُنہوں نے وہی کچھ کیا جو پہلے کرتے آئے ہیں تو ماضی میں ایسا کرنے والوں کا انجام بیان کیا جاچکا ہے۔''

اہلِ کتاب کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿١١٠﴾﴾ (آلِ عمران)

''اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو یقیناً یہ اُن کے حق میں بہتر ہوتا۔ اُن میں سے کچھ ایمان لانے والے ہیں لیکن اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں۔''

منافقین کے بارے میں فرمان جاری ہوا:

﴿مَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِیْمًا ﴿١٤٧﴾﴾ (النساء)

''اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور ایمان لے آؤ؟ اور اللہ قدر دان اور سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو بھیجنے کی غرض و غایت یوں بیان فرمائی:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿٤٥﴾ وَّدَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ﴿٤٦﴾﴾ (الاحزاب)

''اے نبیؐ! بے شک ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہ' بشارت دینے والا' خبردار کرنے والا' اللہ کی طرف اُس کے حکم سے بلانے والا اور ایک چمکتا ہوا روشن چراغ بنا کر۔''

رسول اللہ ﷺ نے ہر موقع پر ممکنہ حد تک قتال کو ٹالنے یعنی avoid کرنے اور پُرامن

طریقے سے معاملات کو سنوارنے کی کوشش کی۔ البتہ جہاں تمام کوششیں ناکام ہو گئیں وہاں قتال فی سبیل اللہ کے ذریعے ہٹ دھرمی کرنے والوں سے زمین کا سینہ صاف کیا تاکہ فساد فی الارض کا سدِّباب ہو اور اُن کے ظلم سے لوگوں کو نجات دلائی جائے۔ آپ ﷺ رحمۃٌ لِّلعالمین تھے اور آخری حد تک اللہ کے بندوں کو گمراہی اور جہنم سے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ آیئے اِس حوالے سے آپ ﷺ کی سیرت کے چند اہم نقوش پر غور کرتے ہیں:

(۱) پورے مکی دور میں رسول اللہ ﷺ نے تلوار ہاتھ میں نہیں اٹھائی۔ بُرائی کا جواب بھلائی سے اور گالیوں کے جواب میں دعائیں دے کر مخالفین کو ہمنوا بنانے کی کوشش کی۔ ابوجہل جیسے ہٹ دھرم انسان کے لیے بھی جھولی پھیلا کر ہدایت کی دعا کی۔ طائف والوں کے سنگدلانہ مظالم کے ردِّعمل میں یہ گوارا نہ فرمایا کہ مَلَکُ الجِبال پہاڑوں کو ٹکرا کر درمیان میں واقع طائف کی بستی کو پیس دے بلکہ اِس بستی والوں کے لیے بھی ہدایت ہی کی دُعا فرمائی۔

(۲) مدنی دَور میں جب اللہ کی طرف سے قتال فرض کر دیا گیا اور نبی ﷺ نے غزوۂ بدر سے پہلے آٹھ مہمات روانہ کیں تو ساتھیوں کو لڑنے سے منع فرمایا۔ مقصد یہ تھا کہ قریش کو باور کرایا جائے کہ اُن کی تجارتی گزرگاہیں اب مسلمانوں کی نگرانی میں ہیں اور مسلمان کسی بھی وقت اُن کی معاشی ناکہ بندی کر سکتے ہیں۔ وادیٔ نخلہ میں جب مسلمانوں کے ہاتھوں ایک مشرک کا قتل ہو گیا تو اُس پر بھی آپ ﷺ نے اظہارِ ناپسندیدگی فرمایا۔

(۳) غزوۂ بدر سے پہلے جب رسول اللہ ﷺ ابوسفیان کے قافلے کو روکنے کے لیے نکلے تو اس وقت بھی مقصود خونریزی نہ تھا' لہٰذا ۳۱۳ ساتھیوں کے پاس صرف آٹھ تلواریں تھیں۔

(۴) مقامِ صفراء پر جب رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک بڑا لشکر کیل کانٹے سے لیس ہو کر مدینہ کی طرف آ رہا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے باوجود بعض ساتھیوں کی خواہش کے قافلے کے بجائے لشکر کی طرف جانا پسند کیا۔ مقصود خونریزی ہوتا تو لشکر کے بجائے پہلے ابوسفیان کے قافلہ کی طرف جاتے جس کے ہمراہ صرف پچاس محافظ تھے۔

(۵) غزوۂ اُحد میں جب کفار نے رسول اللہ ﷺ کے دانت شہید کر دیے اور چہرہ خون آلود کر دیا تو اُس وقت آپ ﷺ کی زبان پر الفاظ تھے:

((كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ خَضَبُوْا وَجْهَ نَبِيِّهِمْ بِالدَّمِ وَهُوَ يَدْعُوْهُمْ اِلَى اللّٰهِ)) (۱)

(۱) سنن ابن ماجه' کتاب الفتن' باب الصبر علی البلاء۔

''وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کے چہرے کو خون آلود کر دیا جبکہ وہ اُنہیں اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہے۔''

گویا عین میدانِ جنگ میں بھی زخمی کرنے والے دشمنوں کے لیے بربادی کی بددعا نہیں کی بلکہ اُن کی فلاح کی فکر کی ۔

سلام اُس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اُس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں !

(۶) غزوۂ بدر کے بعد یہودی قبیلہ بنوقینقاع نے بدعہدی کی تو باوجود قدرت رکھنے کے اُنہیں ہلاک نہیں کیا بلکہ جلاوطن کر دیا۔ اِسی طرح کا معاملہ غزوۂ اُحد کے بعد بنونضیر کے ساتھ کیا۔ اِس کے برعکس غزوۂ احزاب کے بعد بنوقریظہ نے رسول اللہ ﷺ کے بجائے حضرت سعد بن معاذؓ سے فیصلہ کرایا اور اُن کے فیصلہ کے نتیجہ میں یہود کے ۶۰۰ افراد قتل کیے گئے۔

(۷) ۶ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے کفار کے ساتھ دب کر صلح حدیبیہ کی حالانکہ اُس وقت مسلمان انتہائی جوش و جذبہ کی کیفیت میں تھے اور وہ بیعتِ رضوان کے ذریعے ''بیعت علی الموت'' کر چکے تھے۔ اِس صلح کا فائدہ یہ ہوا کہ بڑی تعداد میں لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے اور دو ہی سال میں مسلمانوں کی تعداد سینکڑوں سے بڑھ کر ہزاروں تک جا پہنچی۔ خاص طور پر حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ جیسے باصلاحیت لوگ مسلمان ہوئے جو اِس سے قبل اسلام دشمنی میں پیش پیش تھے۔ اللہ نے اُنہیں جہنم سے بچایا اور اُن کے لیے جنت جیسی نعمت کے حصول کا امکان پیدا کر دیا۔ یہ سب نبی اکرم ﷺ کی مدبّرانہ فراست کے نتیجہ میں ہوا۔

(۸) ۷ ہجری میں خیبر کے یہودیوں کو ہلاک کرنے کے بجائے رسول اللہ ﷺ نے اُن سے معاہدہ کیا۔

(۹) ۸ ہجری میں قریش نے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنوخزاعہ کے مقابلے میں اپنے حلیف قبیلہ بنوبکر کی مدد کر کے صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کی۔ آپ ﷺ نے باوجود بدلہ لینے کی قوت رکھنے کے قریش کے خلاف اقدام نہیں کیا بلکہ اُن کے سامنے تین صورتیں رکھیں:

(i) بنوخزاعہ کے مقتولین کا خون بہا ادا کر دو۔

(ii) بنوبکر کی حمایت چھوڑ دو‘ ہم خود اُن سے بنوخزاعہ کے مقتولین کا قصاص لے لیں گے۔
(iii) اگر مذکورہ بالا شرائط تمہیں منظور نہیں تو پھر گویا تم نے صلح توڑ دی ہے۔
قریش کے جوشیلے نوجوانوں نے کہا کہ ہاں ہم نے صلح توڑ دی ہے۔

(۱۰) ۸ ہجری میں قریش کے صلح توڑنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مکہ کی طرف مہم کی تیاری شروع فرمائی۔ اِس مہم کو انتہائی خفیہ رکھا تا کہ قریش مقابلہ کی تیاری نہ کر سکیں اور خونریزی کم سے کم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ محض چند افراد کی ہلاکت ہوئی اور مکہ فتح ہو گیا۔

(۱۱) فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے عام معافی کا اعلان فرمایا۔ فتح مکہ کے دن کو ایک عَلم بردار صحابی حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے **یوم الملحمة** (ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا دن) کہا لیکن آپ ﷺ نے اُن سے عَلم لے لیا اور اُس دن کو **یوم المَرحمة** (رحم کرنے کا دن) قرار دیا۔

(۱۲) غزوۂ حنین کے بعد اہلِ طائف کا محاصرہ جاری نہیں رکھا۔ ورنہ محاصرہ جاری رکھنے سے آخر کار وہ خوراک اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی قلت سے ہلاک ہو جاتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اِن کے چاروں طرف قبائل مسلمان ہو چکے ہیں‘ لہٰذا یہ بھی بالآخر اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

(۱۳) ۹ ہجری میں مشرکین کو دارالاسلام سے نکلنے کے لیے مختلف میعادوں کی مہلت دی۔ کسی کو حُرمت والے مہینوں کی‘ کسی کو چار ماہ کی اور کسی کو طے شدہ معاہدہ کی مدت کی تکمیل کی۔ مقصود اُن کی ہدایت تھی نہ کہ اُنہیں مار دینا۔ یہاں تک فرمایا کہ اگر کوئی مشرک قرآنِ حکیم کی تعلیمات سننا چاہے تو اُسے سننے کا موقع دو اور پھر اُسے اُس کے محفوظ مقام تک پہنچا دو۔

(۱۴) سفر تبوک میں جب رسول اللہ ﷺ تبوک کے مقام پر پہنچے تو قیصر روم نے مقابلہ سے گریز کیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ آپ ﷺ نے اُس کا تعاقب نہیں کیا بلکہ مختلف قبائل سے معاہدات کر کے مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

(۱۵) ایک عادلانہ اسلامی ریاست قائم کر کے مسلمانوں نے اطراف میں بسنے والوں پر حجت تمام کر دی۔ اب جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کے بعد اسلامی ریاست کی توسیع کے لیے اطراف میں بسنے والوں کی طرف پیش قدمی کی تو اُن کے سامنے تین

متبادل پیش کیے۔ اوّل یہ کہ اسلام لے آؤ' ہمارے برابر کے شہری بن جاؤ گے۔ دوئم یہ کہ اسلام کو بحیثیت غالب دین قبول کر لو تو تمہاری جانوں' اموال' املاک' عزت و آبرو اور عبادت گاہوں کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہوگی۔ اگر یہ دو صورتیں قبول نہ ہوں تو پھر تیسری صورت قتال کی ہوگی۔

گویا مقصود لوگوں کو ہلاک کرنا نہیں بلکہ اُنہیں راہِ راست پر لانا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے پوری کوشش فرمائی کہ اپنے ذاتی کردار' اعلیٰ اخلاق' بھرپور تبلیغ اور مخالفین کے لیے پُرخلوص دعائیں کر کے اُن پر حجت پوری کر دی جائے۔ یہی تمام رسولوں کی بعثت کا مقصد تھا۔

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٦٥﴾﴾ (النساء)

''یہ رسول تھے بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے تا کہ نہ رہے لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت رسولوں کے آنے کے بعد۔ اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے کمالِ حکمت والا ہے۔''

البتہ اتمامِ حجت کے باوجود جو لوگ اصلاح پر راضی نہ ہوئے' زمین والوں پر ظلم و ستم کرتے رہے' اللہ کی نافرمانیوں سے اُس کی زمین کو پراگندہ کرتے رہے' اُن کے خلاف انبیاء نے قتال کیا اور زمین کو اُن کی گندگی سے پاک کر دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿٢٥﴾﴾ (الحدید)

''بلاشبہ ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے نازل کیں اُن کے ساتھ کتابیں اور ترازو تا کہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے جس میں شدید جنگ کی صلاحیت (یعنی جنگی قوت) ہے اور لوگوں کے لیے دیگر فائدے بھی ہیں تا کہ اللہ ظاہر کر دے کہ کون غیب میں رہتے ہوئے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ بڑا طاقتور ہے' زبردست ہے''۔

۲) سنت کی ترتیب سے ہٹی ہوئی ہر شے ظلم ہے۔ یہ اللہ کے بندوں کے ساتھ ظلم ہے کہ اُن پر اتمامِ حجت نہ کیا جائے اور اِس کے بغیر ہی اُن کے خلاف اقدام کر کے اُنہیں ہدایت سے

محرومی کی حالت میں جہنم میں داخل کرنے کی کوشش کی جائے۔ دورِ حاضر میں پُرامن ایجی ٹیشن کا طریقہ بھی اتمامِ حجت کی ایک صورت ہے۔

(۳) بحالاتِ موجودہ پُرامن ایجی ٹیشن کے ذریعے تبدیلی کے لیے تیاری کے مقابلہ میں عسکری جدّوجُہد کے لیے دس گُنا زیادہ تیاری کرنی پڑے گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت کے مقابلہ میں ایسی تیاری بظاہر ناممکنات میں سے نظر آتی ہے۔

(٤) پُرامن ایجی ٹیشن کے ذریعے کامیابیوں کی کئی مثالیں سامنے آچکی ہیں لیکن کسی منظم ریاست کے خلاف عسکری جدّوجہد کے ذریعے کامیابی کی کوئی مثال موجود نہیں۔ پہاڑی علاقوں میں گوریلا وار کے ذریعے دشمن کو پریشان تو کیا جاتا رہا ہے لیکن حکومت حاصل کر کے نظام کو تبدیل نہیں کیا جاسکا۔

(٥) پُرامن ایجی ٹیشن کے طریقہ، کار میں بےقصور لوگوں کے مالی' جانی اور آبرو کے نقصانات کے کم امکانات ہیں۔ شہری علاقوں میں گوریلا وار سے یہ نقصانات شدّت کو پہنچ گئے' کئی بستیاں جلادی گئیں' مکانات مسمار کر دیے گئے' بےقصور لوگوں پر تشدد کیا گیا' بہت سے ہلاک کر دیے گئے اور بہت سے پابندِ سلاسل اور کئی عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔

ضروری وضاحت

یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رہے کہ جہاد کی اعلیٰ ترین صورت قتال فی سبیل اللہ ہی ہے۔ اگر ابتدائی مراحل امکانی حد تک تسلی بخش طور پر طے کر لیے گئے ہوں اور دستیاب اہلیت و صلاحیت سے کامیابی کا امکان نظر آئے تو اِسی کو اختیار کرنا سنتِ نبوی ﷺ پر عمل ہے۔ آنجہانی غلام احمد قادیانی کا یہ تصور پرلے درجے کی گمراہی ہے کہ ؎

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

قتال فی سبیل اللہ ہر دور میں اور قیامت تک جائز رہے گا۔ دین کا راستہ روکنے والے یا مسلمانوں پر ظلم وستم کرنے والے کافروں کے خلاف تو ہتھیار اٹھانے میں کوئی اختلاف ہی نہیں۔ اگر کچھ کلمہ گو لیکن فُسّاق و فُجّار مسلمان دین کے راستے میں ایک رکاوٹ بن کر کھڑے ہو گئے ہوں اور آپ نے باقی سارے تقاضے پورے کر لیے ہوں تو کیا اُن کی جانیں اتنی مقدس ہیں کہ اُن کی وجہ سے دین کو پامال رہنے دیا جائے؟ یہ بات نہ عقل کی میزان پر پوری

اترنے والی ہے اور نہ نقل کی میزان پر۔البتہ مسلح جدوجہد کے آغاز کے لیے ضروری ہے کہ:

(i) ایک امیر کی قیادت میں منظم جماعت قائم کی جاچکی ہو۔

(ii) جماعت میں شامل فدائین نے اپنے سیرت وکردار کی ایک ساکھ قائم کرلی ہو۔بقول جگر ؎

مری طرف سے کوئی یہ کہہ دے مجاہدِ بے خبر سے پہلے
صفائے قلب ونظر ہے لازم جہادِ تیغ وتبر سے پہلے!

(iii) جماعت نے معاشرے میں دعوت پہنچانے کا حق ادا کردیا ہو۔بقول اکبرالٰہ آبادی ؎

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے !

(iv) اسباب کے حوالے سے فتح کا غالب امکان محسوس ہو۔

(v) متحارب گروہ سے اگر کوئی معاہدہ ہے تو اسے علی الاعلان ختم کردیا گیا ہو۔(الانفال:۵۸،۷۲)

حاصلِ کلام

نبی اکرم ﷺ کے دَور میں غلبہ دین کے لیے آخری مرحلہ مسلّح تصادم یعنی قتال فی سبیل اللہ کا تھا۔اُس زمانے میں جہاد بالید کے معنی قتال ہی کے تھے' کیونکہ اُس وقت موجودہ سیاسی ادارے وجود میں نہیں آئے تھے اور نہ ہی مظاہروں (demonstrations) کا کوئی طریقہ موجود تھا۔ یہ موجودہ دور کی صورت ہے کہ قتال کے ذریعے کامیابی کا امکان نظر نہیں آرہا۔ ریاست میں برسرِ اقتدار طبقہ کے پاس اپنے قائم کردہ نظام کے تحفظ کے لیے ہر طرح کے اسباب و وسائل اور لاکھوں کی تعداد میں جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ہمہ وقت اور تربیت یافتہ افواج موجود ہیں۔دوسری طرف عوام بالکل نہتے ہیں۔اِس وجہ سے حکومت کے خلاف کسی مسلح تصادم میں کامیابی مشکل نظر آرہی ہے۔مجبوراً تنظیمِ اسلامی' عوامی دباؤ کے ذریعے مظاہروں' سول نافرمانی اور گھیراؤ کی صورت میں آخری اقدام کی تجویز کو متبادل کے طور پر اختیار کرنے کا لائحہ عمل پیش کررہی ہے۔اگر پُرامن طریقہ کار سے اصلاح ممکن ہو تو اس کو اختیار کرنا اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی منشاء اور سنت کے زیادہ قریب ہے۔البتہ اربابِ اقتدار کی بدبختی ہوگی کہ وہ اس پُرامن راستہ کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں اور اللہ کے دین کے نفاذ سے گریز کریں۔اب اگر حالات میں تبدیلی ہو مثلاً فوج ہی کا ایک صالح عنصر نظام کی تبدیلی کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور مسلح جدّوجہد کے ذریعے کامیابی کی صورت پیدا ہوجائے تو پھر آخری چارۂ کار (last option) کے طور پر اسی کو اختیار کرنا ہوگا۔

ریاست میں حصولِ اقتدار کے بعد کا لائحہ عمل

پُرامن ایجی ٹیشن کا طریق کار ریاست میں انقلاب لانے کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ البتہ ریاست میں انقلاب کے استحکام کے بعد اِس کی توسیع کے لیے قتال فی سبیل اللہ کا طریقہ ہی اختیار کرنا پڑے گا۔ ایک ریاست ہی دوسری ریاست کا عسکری اعتبار سے مقابلہ کر سکتی ہے۔ اِس حوالے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یہ الفاظ پیشِ نظر رہیں کہ ''فاختہ کی طرح بے ضرر لیکن سانپ کی طرح چوکنّے رہو''۔ محبت' نرمی اور پُرامن طور پر اصلاح کی کوشش کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم اتنے بے ضرر ہوں کہ دشمنوں کے لیے نرم چارہ بن جائیں۔ لہٰذا نوٹ کیجیے:

(۱) حالتِ امن میں بھی جنگ کے لیے ہر ممکن تیاری کی جائے اور اسباب فراہم کیے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝۶۰﴾ (الانفال)

''(اے مسلمانو!) تم تیاری کرو اُن سے لڑنے کے لیے اپنے امکانی حد تک' قوت اور پلے ہوئے گھوڑوں کی فراہمی کے ذریعہ سے اور اِس تیاری سے تم ڈراتے ہو اللہ کے اور اپنے دشمن کو اور کچھ دوسروں کو بھی جن کو تم نہیں جانتے' اللہ اُنہیں جانتا ہے۔ اور جو بھی تم خرچ کرو گے اللہ کی راہ میں' وہ پورا پورا تمہیں لوٹا دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی جائے گی۔''

بغیر قوت کی فراہمی اور عسکری تیاری کے پُرامن اصلاح کی کوشش کو لوگ کمزوری سمجھیں گے اور اس جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات کی صورت میں سامنے آئے گی۔ اِس حوالے سے ریاست کے ہر شہری کے لیے ضروری عسکری تربیت کو لازم قرار دیا جائے گا۔

(۲) اگر کوئی دشمن مسلمانوں پر حملہ کر دے تو حکمِ باری تعالیٰ ہے کہ اب ڈٹ کر اُس کا مقابلہ کیا جائے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝۱۵ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۶﴾ (الانفال)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تمہاری مڈبھیڑ ہو کافروں سے میدانِ جنگ میں تو دیکھنا پیٹھ نہ پھیر دینا۔ اور جس نے اُس روز پیٹھ پھیر دی سوائے اِس کے کہ وہ جنگی تدبیر کے طور پر یا اپنی جماعت کے ساتھ ملنے کے لیے پیچھے ہٹ رہا ہو' اِس کے علاوہ اگر کسی نے پسپائی اختیار کی تو اُس نے اللہ کا غضب کمایا اور اُس کا ٹھکانہ جہنم ہے' اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔''

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۴۶﴾﴾ (الانفال)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب میدانِ جنگ میں تمہاری مڈبھیڑ ہو جائے دشمن سے تو ثابت قدم رہنا اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرتے رہنا تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور اطاعت کرتے رہنا اللہ کی اور اُس کے رسول ﷺ کی اور آپس میں مت جھگڑنا ورنہ تم ڈھیلے پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور ڈٹے رہنا۔ بے شک اللہ کی نصرت صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اِس حوالے سے نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہمارے لیے رہنما ہے:

((اَیُّهَا النَّاسُ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَسَلُوا اللّٰهَ الْعَافِیَةَ ' فَاِذَا لَقِیْتُمُوْهُمْ فَاصْبِرُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ' ثُمَّ قَالَ: اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ وَمُجْرِیَ السَّحَابِ وَهَازِمَ الْاَحْزَابِ اهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَیْهِمْ))(۱)

''اے لوگو! دشمن سے مقابلہ کی آرزو مت کرو اور اللہ سے عافیت مانگو۔ پھر اگر تمہارا اُس سے مقابلہ ہو ہی جائے تو ڈٹ جاؤ اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے''۔ پھر آپ ﷺ نے دعا فرمائی: ''اے اللہ! اے کتاب کے نازل کرنے والے! اے بادلوں کو چلانے والے! اے دشمن کے لشکروں کو شکست سے دوچار کرنے والے! ہمارے دشمنوں کو ناکام کردے اور اُن کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔''

(۳) جو دشمن مسلمانوں کے خلاف میدانِ جنگ میں آجائے' اُس کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتی جائے۔ معرکۂ بدر میں مسلمانوں نے ۷۰ مشرکین کو قیدی بنا لیا۔ نبی اکرم ﷺ نے ساتھیوں

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب کان النبی اذا لم یقاتل اول النهار......

سے مشاورت فرمائی اور اپنی طبیعت کی نرمی کے پیشِ نظر اُنہیں فدیہ لے کر چھوڑ دینے کی رائے کو قبول فرما لیا۔ اِس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متوجہ کیا گیا:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ (الانفال)

''نبی کے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ اُس کے پاس قیدی ہوتے جب تک کہ وہ زمین میں خون ریزی نہ کر لیتے (یعنی دشمن کو کچل دیتے۔) اے مسلمانو! کیا تم دنیا کا سازوسامان چاہتے ہو' جبکہ اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے کمال حکمت والا ہے۔''

اِس معاملہ میں اللہ کی طرف سے متوجہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فدیہ کی صورت میں مال و دولت کے حصول کو ترجیح دی گئی اور حق کا مقابلہ کرنے والے کفار کو ہلاک نہیں کیا گیا۔ البتہ متوجہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے قیدیوں سے شفقت کا اظہار یوں فرمایا :

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (الانفال)

''اے (نبی ﷺ!) کہہ دیجیے اُن لوگوں سے جو آپ کے پاس قید میں ہیں کہ اگر اللہ کے علم میں تمہارے دل کی کوئی بھلائی ہے تو وہ تمہیں دے دے گا اُس فدیہ سے بہتر جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہیں بخش دے گا۔ اور اللہ بہت بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔''

(۴) جو دشمن مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں ملوث یا شریک ہو' اُس کے خلاف بھی اگر ممکن ہو تو اقدام کیا جائے۔ صلح حدیبیہ کے بعد غطفان کے قبائل اور خیبر میں آباد یہود کے خلاف اقدامات کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف اقدام کے لیے قریش کو بھڑکانے میں پیش پیش تھے۔

(۵) اگر کوئی فریق صلح یا معاہدہ کرنے کے بعد اُسے توڑ دے تو اُس کے خلاف بھی اگر ممکن ہو تو اقدام کیا جائے۔ یہودی قبائل بنوقینقاع' بنونضیر اور بنوقریظہ نے میثاقِ مدینہ کی خلاف ورزی کی اور آپ ﷺ نے اُن کے خلاف اقدام کا فیصلہ فرمایا۔ قریش نے صلح حدیبیہ کو توڑ دیا اور اِس کے بعد آپ ﷺ نے مکہ کی طرف پیش قدمی فرمائی۔

(باقی صفحہ 96 پر)

اسلام۔ دینِ رحمت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اسلام کو اگر دینِ رحمت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ خالقِ کائنات اپنی مخلوق پر رحم کرنے والا ہے۔ الرحمٰن اور الرحیم اُس کے صفاتی نام ہیں۔ بندوں پر اس کی رحمت کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی ایک نیکی کرتا ہے تو اُس کے لیے کم از کم دس نیکیوں کا ثواب لکھا جاتا ہے' جبکہ ایک گناہ ایک ہی شمار ہوتا ہے اور اکثر تو وہ معاف بھی کر دیا جاتا ہے۔ خالقِ کائنات کی رحمت مخلوق کے ہر فرد پر ظاہر اور نمایاں ہے۔ وہ چھوٹے بڑے' نیک و بد' اچھے بُرے' سب کو روزی دے رہا ہے۔ وہ اپنے بندوں کی غلطیاں اور قصور معاف کرنے والا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:
﴿اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٤٣﴾﴾ (البقرۃ) ''بے شک اللہ لوگوں پر بڑا مہربان رحم کرنے والا ہے۔''

آدم علیہ السلام سے قصور ہوا تو خود اللہ تعالیٰ نے توبہ کے کلمات سکھائے' جن کے ذریعے انہوں نے اللہ سے معافی مانگی تو اللہ نے ان کا قصور معاف کر دیا۔ قرآن میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿٣٧﴾﴾ (البقرۃ) ''بے شک وہ معاف کرنے والا اور صاحبِ رحم ہے۔''

انسان کے اندر کچھ فطری کمزوریاں ہیں جن کی بنا پر اُس سے خطائیں اور گناہ سرزد ہو جاتے ہیں' مگر یہی خطاکار انسان جب گڑگڑا کر پروردگار کے سامنے آہ وزاری کرتا اور اپنے قصور کا اعتراف کرتا ہے تو ربِّ کائنات اُس کے قصور بڑی آمادگی کے ساتھ معاف کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦٠﴾﴾ (البقرۃ)

''تو میں اُن کے قصور معاف کر دیتا ہوں' اور میں بڑا معاف کرنے والا' رحم والا ہوں۔''

بس ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان اپنے خالق و مالک کا باغی اور نافرمان نہ ہو' بلکہ حقوق اللہ کی ادائیگی میں کوشاں اور مخلوقِ خدا کی خدمت میں لگا رہے اور اللہ کی رحمت کا

امیدوار رہو۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱﴾ (آل عمران)

''(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو' اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔اور اللہ بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی ہر صفت بے پایاں اور لامحدود ہے۔اسی طرح اس کی رحمت بھی بے حد و حساب ہے۔اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نرم برتاؤ کرنے والا ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے' اور نرمی پر وہ کچھ عطا کرتا ہے جو سختی پر عطا نہیں کرتا اور نہ نرمی کے علاوہ کسی اور چیز پر عطا کرتا ہے''۔ (مسلم)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ﴾ (الاعراف:۱۵۶) ''بے شک میری رحمت ہر چیز پر غالب ہے۔''

محمد رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور انسان کامل ہیں۔آپؐ کی زندگی تمام انسانوں کے لیے نمونہ ہے۔آپؐ اخلاق کے اعلیٰ مقام پر تھے۔آپؐ نے فرمایا مجھے اخلاقی خوبیوں کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے۔چنانچہ آپؐ کے مزاج میں نرمی ایک نمایاں صفت کی حیثیت سے موجود تھی۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۷﴾ (الانبیاء) ''ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔'' چنانچہ آپؐ کی پوری زندگی رحم دلی کی مظہر ہے۔قرآن مجید میں آپؐ کی شان میں ﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲۸﴾ (التوبۃ) کے الفاظ آئے ہیں' یعنی آپؐ مسلمانوں پر بہت شفیق اور رحمدل ہیں۔حضرت انس رضی اللہ عنہ سالہا سال تک آپ کے خادم رہے' وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اتنے نرم مزاج تھے کہ اگر میں نے کوئی کام کیا تو نبی اکرم ﷺ نے کبھی مجھے یہ نہ فرمایا کہ تو نے یہ کام اس طرح کیوں کیا؟ اور اگر میں نے کوئی کام نہ کیا تو آپؐ نے مجھے کبھی یہ نہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا؟ (بخاری' کتاب الوصایا)

ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ مشرکین کے لیے بددعا کیجیے۔آپؐ نے فرمایا: ''مجھے لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا' مجھے تو صرف رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔'' (مسلم' کتاب البر والصلۃ)۔آپؐ نے اہلِ ایمان کو تلقین کی کہ وہ دوسروں کے لیے نرمی کا رویہ اختیار

کریں۔ چنانچہ آپؐ کے صحابہ آپس میں اس قدر رحیم و کریم تھے کہ قرآن مجید میں ان کا ذکر رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ کے الفاظ سے کیا گیا ہے‘ یعنی وہ (اصحابِ رسولؐ) آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رحم اور نرمی کا برتاؤ کرنے والے تھے۔ آپؐ نے کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا‘ نہ کسی عورت کو نہ کسی خادم کو‘ سوائے اس کے کہ آپؐ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مصداق بننے کے لیے ضروری ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا رویہ رکھے‘ یہی اُسوۂ رسولؐ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا''۔ (ترمذی‘ ابواب البر والصلۃ) آپؐ بچوں کے ساتھ پیار اور محبت سے پیش آتے‘ اُن کو سلام کرتے‘ اُن کے ساتھ ہاتھ ملاتے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے اپنے نواسے حسنؓ کا بوسہ لیا‘ اقرع بن حابس‘ تُند مزاج بدّو سردار پاس تھا‘ کہنے لگا میرے دس بچے ہیں میں نے آج تک اُن میں سے کسی کا کبھی بوسہ نہیں لیا۔ آپؐ نے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا: ''جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا''۔ (بخاری)

اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں چھوٹوں پر رحم اور شفقت کی بڑی اہمیت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں''۔ (بخاری‘ کتاب الادب) چھوٹوں میں صرف بچے نہیں بلکہ یتیم‘ غریب‘ مظلوم‘ بیمار اور دوسرے ہر طرح کے کمزور افراد شامل ہیں۔ ان کے ساتھ اظہارِ ہمدردی اور رحم دلی کا سلوک لازمی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی ہمدردی اور رحم دلی کا یہ حال تھا کہ نماز پڑھانے والوں کو آپؐ ہدایت کرتے کہ ہلکی نماز پڑھائیں‘ کیونکہ نمازیوں میں کمزور‘ بیمار اور بوڑھے (سبھی طرح کے لوگ) ہوتے ہیں اور جب تم میں سے کوئی تنہا نماز پڑھے تو جتنی چاہے لمبی پڑھے۔ (بخاری‘ کتاب الاذان)

رسول اللہ ﷺ دوسروں کی تکالیف اور مشکلات کو محسوس کرتے تھے‘ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر آپؐ پریشان ہو جاتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: ''میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ اسے طُول دوں مگر پھر میں (نماز پڑھنے والی عورتوں میں سے کسی کے) بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو اپنی نماز میں اختصار سے کام لیتا ہوں (یعنی قراءت لمبی نہیں کرتا کیونکہ) مجھے یہ ناپسند ہوتا ہے کہ اس کی ماں کی تکلیف کا باعث بنوں''۔ (بخاری‘ کتاب الاذان)

رسول اللہ ﷺ نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو کوئی مؤمن مال چھوڑ جائے تو اس کے قریبی رشتہ دار اس مال کے وارث ہوں گے اور جو کوئی قرض چھوڑ جائے یا ایسے بال بچے چھوڑ جائے

جن کی گزر اوقات کا کوئی سامان نہ ہو تو وہ میرے پاس آئیں میں ان کا مددگار ہوں گا (یعنی قرضہ ہوگا تو وہ میں ادا کر دوں گا اور بال بچے محتاج ہوں گے تو اُن کی گزران کا انتظام کر دوں گا)۔ (سنن النسائی' کتاب التفسیر)

رسول اللہ ﷺ دوسروں کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے' کسی پر ایسی ذمہ داری نہ ڈالتے جس سے وہ تکلیف میں پڑ جائے' کیونکہ دینِ اسلام کے مزاج میں سختی نہیں بلکہ نرمی ہے۔ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم کچھ قریب العمر نوجوان رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور بیس راتیں آپؐ کے پاس ٹھہرے۔ پھر آپؐ نے گمان کیا کہ ہم اپنے گھر والوں کے پاس جانے کے مشتاق ہیں۔ پس آپؐ نے ہم سے پوچھا کہ تم کن کن اہل خانہ کو پیچھے چھوڑ آئے ہو؟ تو ہم نے آپؐ کو بتایا۔ (چونکہ آپؐ بڑے نرم مزاج اور رحم دل تھے تو) آپؐ نے فرمایا کہ تم اپنے گھر والوں کے پاس واپس جاؤ۔ اور (جو کچھ یہاں سیکھا ہے وہ جا کر) انہیں سکھاؤ اور انہیں (نیک اعمال کرنے کا) حکم دو' اور نماز پڑھو جیسے کہ تم نے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے ایک تمہارے لیے اذان دے اور تم میں سے جو سب سے بڑا ہو وہ تمہاری امامت کرے۔ (بخاری' کتاب الآداب)

یہ سب واقعات بتا رہے ہیں کہ اُسوۂ حسنہ جو دین اسلام کی عملی شکل ہے اس میں رحم دلی اور نرمی کی کس قدر اہمیت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے دل میں پوری اُمت کا درد تھا' آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ کوئی فردِ بشر دوزخ کا ایندھن نہ بنے بلکہ گناہگاروں کی بھی کسی طور بخشش ہو ہی جائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر نبی کی ایک دعا (ضرور قبول) ہوتی ہے' اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اگر خدا کو منظور ہو تو میں اپنی دعا کو قیامت کے دن اپنی اُمت کی شفاعت کرنے کے لیے محفوظ رکھوں۔ (بخاری' کتاب التوحید)

اسلام صرف مسلمانوں کے ساتھ رحم دلی اور نرمی کا حکم نہیں دیتا بلکہ اسلام تو روئے زمین کے تمام انسانوں کے ساتھ نرمی کی تعلیم دیتا ہے۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی پُرامن غیر مسلم کے لیے تکلیف کا باعث بنے۔ اگر مسلمان کا ہمسایہ غیر مسلم ہو تو اُس کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کرنا اور ضرورت کے وقت اُس کی مالی اور اخلاقی مدد کرنا مسلمان پر لازم ہے۔ کسی غیر مسلم کو اسلام پیش تو کیا جائے گا مگر اسے قبولِ اسلام پر مجبور نہیں کیا جا سکتا' جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ (البقرۃ:۲۵۶) ''دینِ اسلام (قبول

کرنے میں) کسی طرح کا جبر نہیں''۔ رسول اللہ ﷺ کے مبارک عہد اور دورِ صحابہؓ میں اسلام قبول کرنے والے مشرکین اور یہود و نصاریٰ میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جسے جبراً مسلمان کیا گیا ہو بلکہ اسلام قبول کرنے والے سب کے سب اسلامی اخلاق سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے۔ مشہور ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے قرب و جوار میں آباد غیر مسلموں کی تیمار داری کے لیے جاتے اور ان کی مدد کرتے تھے۔ جب محمد بن قاسمؒ سترہ سالہ نوجوان' فاتح سندھ بن کر برصغیر میں وارد ہوا تو اس نے یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیا کہ لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ محمد بن قاسم نے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی تعمیر و مرمت میں ان کی امداد بھی کی۔

اسلامی تعلیمات میں بنی نوع انسان سے حسنِ سلوک کی پُرزور تلقین تو ہے ہی' یہاں تو جانوروں تک کو ستانے اور تکلیف دینے کی سختی سے ممانعت ہے۔ آپؐ نے اُس عورت کو دوزخی کہا ہے جس نے ایک بلی کو بھوک اور پیاس میں مبتلا رکھ کر مار دیا تھا۔ (بخاری' کتاب الانبیاء) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم (جانور کو) ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو۔ تم میں ہر ایک کو چاہیے کہ اپنی چھری تیز کر لے اور جس جانور کو ذبح کر رہا ہے اسے (حتی الامکان) آرام پہنچائے۔ (مسلم' کتاب الصید والذبائح) ایک دفعہ آپ ﷺ ایک اونٹ کے پاس سے گزرے جس کا پیٹ پشت سے لگا ہوا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: ''ان بے زبانوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو' ان پر اچھے طریقے سے سواری کرو اور انہیں اچھی طرح کھلاؤ (پلاؤ)''۔ (ابوداؤد' کتاب الجہاد) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی جاندار شے کو نشانہ مت بناؤ (یعنی نشانہ بازی کی مشق کرنے کے لیے کسی جاندار شے کو نشانہ پر نہ رکھو''۔ (مسلم' کتاب الصید والذبائح)

جانوروں کے بارے میں دینِ اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ جانوروں کے کھانے پینے کا پورا دھیان رکھا جائے' ان سے اتنا زیادہ کام نہ لیا جائے جو انہیں نڈھال کر دے' ان پر بوجھ لادنا ہو تو اتنا نہ لادا جائے جو ان کے لیے تکلیف کا باعث ہو' ان سے ہر وقت کام نہ لیا جائے بلکہ انہیں آرام کا وقت بھی دیا جائے' جانوروں کے گھروں کو جلایا نہ جائے' پرندوں کے گھونسلوں سے بچے اٹھا کر انہیں دکھ نہ دیا جائے۔ بعض جگہوں پر جانوروں کو لڑانے کا رواج ہے' اسلام میں اس کی سختی سے ممانعت ہے۔ (ابوداؤد' کتاب الجہاد' باب التحریش بین البہائم)

دین اسلام میں رحم دلی اور نرمی پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ کسی موذی جانور کو بھی ظالمانہ طریقے سے ہلاک کرنے کی اجازت نہیں بلکہ اس کو اس طرح مارا جائے کہ اُسے کم سے کم تکلیف ہو۔ اسی طرح کسی کو آگ میں جلانا بھی جائز نہیں۔

دین اسلام دین الحق ہے۔ یہ اللہ کا دین ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پسند کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمان اور رحیم ہے یعنی اپنی مخلوق پر رحمت اور شفقت کرنا اس کی شان ہے۔ وہ اپنے بندے کے تھوڑے سے اچھے عمل پر بہت زیادہ اجر دیتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے: ((اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ)) ''مخلوق اللہ کا کنبہ ہے''۔ خاندان کے سرپرست کو اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ محبت اور ہمدردی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ہر وقت نظرِ رحمت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جن میں رحمٰن' رحیم' غفور اور غفار بھی ہیں۔ رحمٰن بڑا مہربان' رحیم بہت رحم کرنے والا' غفور اور غفّار گناہ اور خطائیں بخشنے والا۔ اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام رحمٰن' رحیم' غفور اور غفّار قرآن مجید میں بالترتیب ۵۷' ۹۵' ۹۱ اور ۵ مرتبہ آئے ہیں۔ گویا بار بار انسان کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے مالک کی رحمت سے فائدہ اٹھانے کی روش اختیار کرے اور دنیا و آخرت میں فوز و فلاح سے ہمکنار ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے زندگی بھر کسی سے انتقام نہیں لیا حالانکہ کفار و مشرکین نے آپؐ کو ستانے اور اذیت پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بلکہ آپؐ تو ہر طرح کی تکلیف اور سختی برداشت کر کے بھی کفار کو راہِ حق پر چلنے کی دعوت دیتے رہے۔ آپؐ کی رحمت اور رأفت کا یہ حال تھا کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی نے وفات پائی تو اس کے بیٹے کی خواہش پر آپؐ نے اپنا کُرتہ عطا فرما دیا تا کہ عبداللہ بن اُبی کو اس کا کفن دیا جائے۔ پھر آپؐ نے اُس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ۝۸۴﴾ (التوبة)

''اور آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا' کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق ہیں۔''

مجموعی طور پر دین اسلام میں نرمی' تواضع اور دوسروں کے ساتھ آسانی کی تعلیم ہے۔ ہمسایوں' دوستوں' ساتھیوں اور رشتہ داروں کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

خالقِ کائنات کو اپنے بندوں پر سختی پسند نہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

﴿یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتا ہے اور وہ تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا۔''

دینِ اسلام کی نرم مزاجی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاشرے کا ہر فردِ بشر جو مرضی کرتا پھرے' اُس کے ساتھ بس نرمی ہی برتی جائے گی۔ بلکہ ماحول کو پُرامن رکھنے کے لیے ضروری اقدام کرنے ہوں گے' عدالتی نظام میں عدل وانصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں گے' کسی بڑے یا چھوٹے کو دوسروں کے حقوق تلف کرنے کی اجازت نہ ہو گی' چور اور ڈاکو لازماً سزا پائیں گے' اس کے علاوہ دوسرے جرائم ثابت ہونے پر شرعی قوانین کے مطابق سزا دی جائے گی' قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے گا اور بڑی سے بڑی سفارش اُسے سزا سے نہیں بچا سکے گی' البتہ اگر مقتول کے وارث ہی معاف کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ جرائم کی سزا اسلامی ضابطے کے مطابق عوام الناس کے سامنے اعلانیہ دی جائے گی جس کو سب لوگ دیکھیں اور عبرت پکڑیں۔ زنا کی سزا کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

﴿اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْکُمْ بِھِمَا رَاْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْیَشْھَدْ عَذَابَھُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۲﴾ (النور)

''بدکاری کرنے والی عورت اور مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو' اور اللہ کا حکم نافذ کرنے میں تمہیں اُن پر ترس نہ آئے اگر تم اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان دونوں کی سزا کو اہلِ ایمان کی ایک جماعت دیکھے۔''

جہاں تک رحم و رأفت کا تعلق ہے تو یہ صرف ذاتیات تک ہے۔ جو شخص مسلم معاشرے کے لیے نقصان اور اذیت کا باعث بن کر مجرم ثابت ہو گا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا' کیونکہ مجرم پر رحم کھانا ظالم کی حمایت کے مترادف ہے جس کی کسی صورت اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اسلام میں مختلف جرائم کی سزائیں مقرر ہیں۔ یہ سزائیں مجرموں کو سرِعام دی جائیں گی۔ سزاؤں کا یہ انداز بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہے' کیونکہ جب معاشرے کے عام افراد یہ منظر دیکھیں گے تو ان کو جرائم سے دور رہنے کا درس ملے گا اور وہ جرائم سے باز رہیں گے۔ اس طرح معاشرہ امن کا گہوارہ بن جائے گا۔ OO

اُمّتِ مُسلمہ ـــــ اُمّتِ وَسط ہے

عتیق الرحمٰن صدیقی

عربی زبان کے لفظ ''وسط'' کا لغوی مفہوم اہلِ لغت نے یوں بیان کیا ہے:
وَسَطُ الشَّیء۔ ہر چیز کی درمیانی جگہ' جہاں سے اس کے دونوں اطراف کا فاصلہ مساوی ہو۔ اس کا استعمال کیتِ متصلہ یعنی ایک جسم پر ہوتا ہے' جیسے وَسَطُهٗ صُلْبٌ (اس کا درمیان سخت ہے) ضَرَبْتُهٗ وَسَطَ رَأْسِهٖ۔ لیکن وَسْط (بالسکون) کیتِ منفصلہ پر بولا جاتا ہے' یعنی دو چیزوں کے درمیانِ فاصل کو وَسْطٌ کہا جاتا ہے' جیسے وَسْطُ الْقَوْمِ كَذَا کہ وہ لوگوں کے درمیانِ فاصل ہے۔ نیز الوسَط (بفتح السین) اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو دو مذموم اطراف کے درمیان واقع ہو' یعنی معتدل' جو افراط و تفریط کے بالکل درمیان ہوتا ہے' مثلاً 'جود' بخل اور اِسراف کے درمیانی درجہ کا نام ہے اور معنی اعتدال کی مناسبت سے یہ لفظ عدل اور نصفة سواء کی طرح ہر عمدہ اور بہترین چیز کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً جو شخص اپنی قوم میں بلحاظِ حسب سب سے بہتر اور اونچے درجے کا ہو اس کے متعلق هذا وسَطهم حسبًا کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں اُمتِ مسلمہ کے متعلق فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ (البقرة:۱۴۳) ''اور اس طرح ہم نے تم کو اُمتِ معتدل بنایا''۔ اسی طرح آیت ﴿قَالَ اَوْسَطُهُمْ﴾ (القلم:۲۸) ''ایک جوان جو اُن میں فرزانہ تھا بولا'' میں بھی اوسط کا لفظ اسی معنی پر محمول ہے۔ (مفردات القرآن' جلد دوم)

قرآن حکیم نے اسلام کے نام لیواؤں کو اُمتِ مسلمہ کے نام سے موسوم کیا اور اس پر اس کی حقیقت اور اس کے وظیفۂ حیات کو واضح کیا' نوعِ انسانی میں اس کے اصل مقام کا تعین فرمایا اور اس کے بنیادی کردار اور تقاضوں سے اسے روشناس کیا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرة:١٤٣)

''اور ہم نے تم کو اسی طرح اُمتِ وسط بنایا ہے تا کہ تم انسانوں پر (حق کے) گواہ ہو اور رسول (ﷺ) تم پر گواہ ہوں۔''

یہ اُمت حق کی گواہی اس طرح دے گی کہ انسانوں میں عدل وقسط کا قیام عمل میں آئے اور وہ صحیح اقدار کی حقانیت کا اقرار کرنے لگیں۔ وہ حق و باطل کے مابین فرق کرے گی' وہ دوسروں کی اقدار' ان کے تصورات اور رسوم و اعمال کا ناقدانہ جائزہ لے کر بتائے گی کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ وہ چونکہ خود انسانوں پر نگران اور گواہ ہے اس لیے دوسرے اس سے اخذ و استفادہ کے پابند ہوں گے۔

◆ سید قطبؒ اپنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''اُمّتِ مسلمہ اُمّتِ وسَط ہے' وسط کے ہر مفہوم کے لحاظ سے' خواہ اس لفظ کو وساطت سے مانا جائے جس کے معنی حسن و خوبی اور فضیلت کے ہیں' یعنی وہ سب سے بہتر اور سب سے افضل اُمت ہے یا **وسط** سے ہو جس کے معنی اعتدال کے ہیں' یعنی وہ معتدل اُمت ہے' یا مادی اور محسوس معنی میں وسط ہو یعنی وہ بیچ کی اُمت ہے۔''

وہ مزید لکھتے ہیں:

☆ اُمّتِ مسلمہ اُمّتِ وسَط ہے اعتقادات اور تصورات کے پہلو سے! وہ روحانیت کے لیے یکسو ہونے کے سلسلے میں غلو کرتی ہے اور نہ مادیت کی پستیوں میں گرتی ہے۔ وہ انسانی فطرت کا اتباع کرتی ہے...... وہ زندگی کے ارتقاء اور اس کی رفعت و بلندی کے لیے کام کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی حفاظت اور اس کے تسلسل کے لیے بھی کام کرتی ہے۔ وہ جذبات و خواہشات کی دنیا میں بھی افراط و تفریط کے بغیر اعتدال' توازن اور تناسب کے ساتھ پوری دلچسپی لیتی ہے۔

☆ اُمّتِ مسلمہ اُمّتِ وسَط ہے علم و فکر کے پہلو سے! اسے جو علم بھی حاصل ہو اس کے سلسلہ میں وہ جمود کی راہ اختیار نہیں کرتی اور علم و تجربے کی راہیں اپنے اوپر مسدود نہیں کرتی...... اس کا دائمی شعار اور طریقہ یہ ہے کہ حقیقت مؤمن کی گمشدہ متاع ہے' وہ جہاں اسے پاتا ہے' تحقیق کے بعد یقین سے اُسے اپنا لیتا ہے۔

☆ اُمّتِ مسلمہ اُمّتِ وسَط ہے نظم اور اجتماعیت کے معاملہ میں بھی! وہ پوری زندگی کو افراد کے جذبات و احساسات کے حوالے نہیں کرتی' نہ پوری زندگی کو قانون' نظم اور ڈسپلن کے سپرد کرتی ہے...... وہ لوگوں کو اقتدار کے کوڑے کے حوالے نہیں کرتی اور نہ انہیں وجدان کی ''وحی'' کے حوالے کرتی ہے بلکہ دونوں میں امتزاج اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔

☆ اُمتِ مسلمہ اُمتِ وسط ہے فرد اور جماعت کے مابین روابط کے پہلو سے بھی! وہ فرد کی شخصیت اور اس کی تشکیل کے عوامل کو ضائع نہیں کرتی' نہ اس کی شخصیت کو جماعت اور حکومت کی شخصیت میں گم کرتی ہے۔ وہ فرد کو بالکلیہ آزاد بھی نہیں چھوڑتی کہ وہ خودسَر اور خودغرض بن جائے اور اپنی ذات کے سوا اُسے کسی کی فکر نہ ہو۔

☆ اُمتِ مسلمہ کرۂ ارض میں اپنے جائے وقوع اور اپنے علاقوں کے روئے زمین کے وسط میں ہونے کے پہلو سے بھی اُمتِ وسط ہے۔

☆ زمانے کے اعتبار سے بھی اُمتِ مسلمہ اُمتِ وسط ہے۔ اس اُمت پر (نوعِ انسانی کا) بچپن کا دور ختم ہوتا ہے اور اس کے قیام کے بعد عقلی بلوغ ورُشد کا جو دور شروع ہوا ہے اس کی وہ محافظ ہے۔ وہ درمیان میں کھڑی ایک طرف ان اوہام وخرافات کو نوعِ انسانی سے جھاڑ کر اسے پاک وصاف کر رہی ہے جو عہدِ طفولیت میں اس سے چمٹ گئے تھے اور دوسری طرف وہ نوعِ انسانی کو موجودہ دور کے عقل وہوائے نفس کے فتنے سے بچانے کا کام بھی کر رہی ہے۔

◆ صاحب ضیاء القرآن آیۂ مذکورہ ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ میں وسط کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''جیسے ہم نے قبلہ کے معاملے میں تمہیں راہِ راست اختیار کرنے کی توفیق بخشی اسی طرح ہر معاملہ میں تمہیں اُمتِ وسط بنایا۔ وسط کا لفظ قابل غور ہے۔ اس کا معنی ہے درمیان۔ ہر چیز کا درمیانی حصہ ہی اُس کا عمدہ ترین حصہ ہوا کرتا ہے۔ انسان کی زندگی کا درمیانی عرصہ ''عہد شباب'' اس کی زندگی کا بہترین وقت ہے۔ دن کے درمیانی حصہ دوپہر میں روشنی اپنے نقطۂ عروج پر ہوتی ہے۔ اسی طرح اخلاق میں میانہ روی قابلِ تعریف ہوتی ہے' افراط وتفریط دونوں پہلو مذموم۔ بخل اور فضول خرچی کی درمیانی حالت کو سخاوت' بزدلی اور طیش کے درمیانی حال کو شجاعت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُمت محمدیہ کو اس عظیم المرتبت خطاب سے سرفراز فرمایا۔ ان کے عقائد' ان کی شریعت' ان کے نظامِ اخلاق' سیاست اور اقتصاد میں افراط وتفریط کا گزر نہیں' یہاں اعتدال ہے' توازن ہے' موزونیت ہے۔''

◆ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اپنی تفسیر ''تفہیم القرآن'' میں فرماتے ہیں:

''اُمتِ وسط کا لفظ اپنے اندر اس قدر وسیع معنویت رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا' اس سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے

جو عدل و انصاف اور توسّط کی روش پر قائم ہو' جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو' جس کا سب کے ساتھ یکساں' حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق و ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔''

◆ مولانا امین احسن اصلاحی ''تدبر قرآن'' میں وسط کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وسط لفظ ولد کی طرح مذکر اور مؤنث' واحد اور جمع سب کے لیے آتا ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ شے جو دو طرفوں کے درمیان بالکل وسط میں ہو۔ یہیں سے اس کے اندر بہتر ہونے کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ جو شے دو کناروں کے درمیان ہو گی وہ نقطۂ توسّط اور اعتدال پر ہو گی اور یہ اس کے بہتر ہونے کی ایک فطری دلیل ہے۔ اُمتِ مسلمہ کو اُمتِ وسط کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اُمت ٹھیک ٹھیک دین کی اس بیچ شاہراہ پر قائم ہے جو اللہ تعالیٰ نے خلق کی رہنمائی کے لیے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے کھولی ہے' جو ابتدا سے ہدایت کی اصل شاہراہ ہے۔ یہود و نصاریٰ اللہ کے نبیوں میں تفریق کر کے اس شاہراہ سے ہٹ گئے اور انہوں نے یہودیت و نصرانیت کی پگڈنڈیاں نکال لیں' اسی طرح وہ اصل قبلہ سے منحرف ہو کر مشرق و مغرب کے جھگڑوں میں پڑ گئے۔ لیکن یہ اُمت ان کج پیچ راہوں میں بھٹکنے کے بجائے دین کی اصلی راہ پر قائم ہے۔ اس کا کلمہ تفریق کے بجائے وحدت کا کلمہ ہے۔''

◆ مولانا عبدالماجد دریابادی ''تفسیر ماجدی'' میں ''اُمَّةً وَّسَطًا'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یعنی ایسی اُمت جو ہر اعتبار اور ہر معیار سے غایتِ اعتدال پر ہو' ہر کجی اور ہر افراط و تفریط سے پاک۔ وسطًا' عربی زبان میں یہ لفظ خاص مدح کے موقع پر آتا ہے **واما الوسط فانه فی کلام العرب الخیار** (ابن جریر) **استعیر للخصال المحمودة بوقوعها بین طرفی افراط و تفریط** (بیضاوی)۔ حدیث نبویؐ میں وسط کی تفسیر عدل سے آئی ہے **عن ابی سعید الخدری عن النبی ﷺ امةً وسطًا قال عدلاً** (ابن کثیر عن احمد) اور ائمۂ لغت سے بھی یہی معنی منقول ہیں۔ **قال الجوھری فی الصحاح امةً وسطًا ای عدلا وھو الذی قاله الاخفش والخلیل وقطرب** (کبیر)۔ آیت سے یہ استنباط بھی کیا گیا ہے کہ اجماعِ اُمّت حجّت ہے۔ **احتج جمھور الاصحاب وجمھور المعتزلة علی ان اجماع الامة حجة** (کبیر)۔''

◆ حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی تفسیر ''ابن کثیر'' میں ''وسط'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وسط کے معنی یہاں پر بہتر اور عمدہ کے ہیں' جیسے کہا جاتا ہے کہ قریش نسب کے اعتبار سے وسطِ عرب ہیں' اور کہا گیا ہے کہ حضور ﷺ اپنی قوم میں وسط تھے یعنی اشرف نسب والے' اور صلوٰۃِ وسطیٰ یعنی افضل تر نماز عصر ہے' جیسے صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ چونکہ تمام اُمتوں میں یہ اُمت بہتر' افضل اور اعلیٰ تھی اس لیے انہیں شریعت میں راستہ بھی بالکل درست ملا اور دین بھی بہت واضح دیا گیا۔ جیسے فرمایا: ﴿هُوَ اجْتَبٰـكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰـكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾ (الحج:۷۸) ''اُس اللہ نے تمہیں چن لیا اور تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں کی۔ تمہارے باپ ابراہیم جس کے دین پر تم ہو' اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے اس سے پہلے بھی اور اس میں بھی تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔''

اِفراط وتفریط' انتہا و شدّت پسندی اور غلو کو کسی دور میں بھی مستحسن نہیں سمجھا گیا اور نہ کبھی اس کے نتائج وثمرات خوشگوار نکلے ہیں۔ اس سے تلخیاں اور ترشیاں بڑھی ہیں' عناد اور تنفّر میں اضافہ ہوا ہے' دوریاں پیدا ہوئی ہیں' جبکہ اس کے مقابلہ میں اعتدال' توسّط اور میانہ روی کو ہمیشہ سراہا گیا ہے۔ اسلام کا نمایاں وصف یہ ہے کہ اس نے زندگی کے عام شعبوں میں توازن اور اعتدال کو رواج دیا ہے۔ نہ صرف اعتقادی طور پر یہ وصف موجود رہا ہے بلکہ عبادات میں بھی اعتدال کی ترغیب دی گئی ہے۔ معاشرتی' معاشی اور تمدنی اعتدال بھی اسلام کا خاصّہ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو تمام انبیاء ورسل پر فضیلت عطا کی' ایک جامع اور اکمل کتاب آپؐ پر نازل فرمائی' آپؐ کی اُمت کو صحت مندانہ مزاج اور اعلیٰ درجے کے اعتدال سے بہرہ مند فرمایا' اس پر علوم ومعارف کے دروازے کھولے اور اس کے دائرۂ عمل کو اتنا وسیع کیا کہ اسے خیرِ اُمّت کے نام سے موسوم کیا اور ''اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ'' کا منصب عطا فرمایا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران:۱۱۰)

''تم بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے۔''

حضور ﷺ کے ارشادِ گرامی ((اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ))[۱] میں یہ واضح فرما دیا گیا کہ دین نام ہی اس بات کا ہے کہ مسلمانوں کی خیر خواہی کی جائے اور انہیں بُرے کاموں سے دور رکھا جائے۔ گویا

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب الدین النصیحۃ...... وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان ان الدین النصیحۃ۔

اُمتِ محمدیہ کو معتدل اُمت کے خطاب سے نواز کر واضح کر دیا کہ انسان کا جوہر' شرافت و فضیلت اس اُمت میں بدرجۂ اَتم موجود ہے۔

محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے ایک اُجڈ' اکھڑ اور جاہل معاشرے میں دعوتِ حق کا اعلان فرمایا' جہاں تاریکی تو تھی مگر روشنی کی کرن بھی کم ہی دکھائی دیتی تھی' آوازِ حق پر کان دھرنے والے بہت کم تھے اور سرچشمۂ فیض سے فیض یاب ہونے کے لیے آمادہ و تیار نہ تھے۔ رسول اکرم ﷺ ان کے کفر و شرک' سوءِ عمل اور بدعت و ضلالت میں مبتلا ہونے پر ملولِ خاطر تھے' خاصے پریشان اور ہلکان ہوئے جا رہے تھے۔ آپؐ حکمت' موعظۂ حسنہ' تبادلۂ خیال اور مجادلۂ احسن کی صورتیں اختیار کر رہے تھے مگر جواب میں نہایت بھونڈا' کریہہ اور جارحانہ انداز اپنایا جا رہا تھا۔ حضور ﷺ کی افسردگی اور غمزدگی پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ طٰہٰ میں فرمایا:

﴿طٰهٰ ① مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ② اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ③﴾

''طٰہٰ' ہم نے یہ قرآن اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ' بلکہ یہ تو ایک یاددہانی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو (اللہ سے) ڈرے۔''

یہاں قیامِ حق کے لیے توازن ملحوظ رکھنے کی تلقین کی جا رہی ہے' جی ہلکان کرنے سے منع کیا جا رہا ہے اور اس میں شدت پر نقد کیا جا رہا ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں فرمایا گیا کہ یہ کائنات متوازن بنائی گئی ہے' اس کا سارا نظام عدل پر قائم کیا گیا ہے:

﴿وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ⑦ اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ ⑧ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ⑨﴾ (الرحمٰن)

''آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم کر دیا۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو' انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔''

گویا کائنات کی ہر شے توازن و تناسب کی عکاس ہے' اس لیے جذبات و احساسات میں بھی اسی توازن کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ دعا اور نماز میں بھی ہمیں معتدل آواز کی تلقین فرمائی گئی ہے:

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ⑪⓪﴾

(بنی اسراءیل)

''اور اپنی نماز نہ زیادہ بلند آواز سے پڑھو اور نہ بہت پست آواز سے' ان دونوں کے درمیان اوسط درجے کا لہجہ اختیار کرو۔''

یعنی نہ تو چلّا کر نماز پڑھی جائے کہ نمائش ہو جائے اور نہ بالکل چپکے چپکے' کہ ساتھ والے بھی نہ

سن سکیں' بلکہ بیچ کی راہ اختیار کی جائے۔ یہ حکم خاص طور پر نماز تہجد میں قراءت کا ہے۔

اسی طرح چال میں بھی وقار کو ملحوظ خاطر رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ﴾ (لقمان: ۱۹) یعنی چال میں تمکنت اور وقار ہو' نہ ایسی چال کہ اس سے گھمنڈ ظاہر ہو اور نہ ایسی چال جو اس کی مذموم نفسی کیفیت کی مظہر ہو۔ اس میں نمائشی تواضع اور دکھاوے کی خدارسیدگی نہ ہو بلکہ ایک متین اور شریف آدمی کی سی چال ہو۔ فیاضی بھی ایک قابلِ تعریف عمل ہے مگر اس میں بھی بے اعتدالی سے اجتناب کرنے کی نصیحت کی گئی ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ (بنی اسراء یل)

''نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔''

مطلب یہ ہے کہ خرچ کرنے میں اتنا اعتدال ہونا چاہیے کہ انسان نہ تو بخیل بن کر رہے کہ دولت کی گردش رک جائے اور نہ اتنا فضول خرچ ہو جائے کہ معاشی طاقت ضائع ہو جائے' اس کے برعکس اس کے اندر توازن کی صحیح حس موجود ہونی چاہیے۔ سورۃ الفرقان میں رحمٰن کے بندوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾﴾

''اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔''

نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((اِكْلَفُوْا مِنَ الْاَعْمَالِ مَا تُطِيْقُوْنَ)) (۱)

''اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔''

سید سلیمان ندویؒ مذکورہ بالا حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''عمل کا لفظ گو یہاں عام ہے مگر شارحین کے نزدیک اس سے مراد نماز روزہ وغیرہ عبادتیں ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا ہی بوجھ اٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اٹھا سکو اور آخری دم تک نباہ سکو۔ دوسری اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس

---

(۱) صحيح البخاری' کتاب الرقاق' باب القصد والمداومة على العمل۔

اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ تک وسیع ہے۔'' مسند بزار میں کنز العمال' جلد ثانی' صفحہ ۷ کے حوالے سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَا اَحْسَنَ الْقَصد فِی الْغِنٰی' مَا اَحْسَنَ القصد فِی الْفَقْرِ' مَا اَحْسَنَ الْقَصد فِی الْعِبَادَۃِ))
''دولت مندی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے' محتاجی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے' عبادت میں درمیانگی کتنی اچھی ہے۔'' (سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم' جلد ششم' ص ۴۶۸)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نہایت عابد و زاہد صحابی تھے۔ آپؓ نے یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن میں روزہ سے رہیں گے اور رات عبادت میں گزاریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ نے ان سے فرمایا:

((فَلَا تَفْعَلْ' صُمْ وَاَفْطِرْ' وَقُمْ وَنَمْ' فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا' وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا' وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا' وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا' وَاِنَّ بِحَسْبِكَ اَنْ تَصُوْمَ كُلَّ شَهْرٍ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ)) (۱)

''(اے عبداللہ!) تم ایسا نہ کرو' روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو' قیام بھی کرو اور سویا بھی کرو۔ بے شک تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے' تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے' تمہاری بیوی کا بھی حق ہے' تمہارے مہمان کا بھی حق ہے۔ بس تمہارے لیے ہر مہینہ میں تین روزے رکھ لینا کافی ہے۔''

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو بھی آپؐ نے ایسی ہی نصیحت فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ وہ شب و روز عبادت میں مصروف رہتے ہیں' بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے' دن کو روزہ رکھتے ہیں' رات کو سوتے بھی نہیں۔ آپؐ نے ان کو بلا کر پوچھا: ''کیوں عثمان! تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے؟'' عرض کی ''خدا کی قسم میں نہیں ہٹا ہوں' میں آپؐ کے طریقہ کا طلبگار ہوں''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((فَاِنِّیْ اَنَامُ وَاُصَلِّیْ وَاَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاَنْكِحُ النِّسَاءَ ' فَاتَّقِ اللّٰهَ يَا عُثْمَانُ' فَاِنَّ لِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا ' وَاِنَّ لِضَيْفِكَ عَلَيْكَ حَقًّا ' وَاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا ' فَصُمْ وَاَفْطِرْ وَصَلِّ وَنَمْ))(۲)

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب حق الجسم فی الصوم۔

(۲) سنن ابی داوٗد' کتاب الصلاۃ' باب ما یؤمر به من القصد فی الصلاۃ۔

''میں تو سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں' روزہ بھی رکھتا ہوں' افطار (ناغہ) بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ اے عثمان خدا سے ڈرو کہ تمہارے اہل وعیال کا بھی تم پر حق ہے' تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے' تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے۔ پس روزے بھی رکھو اور افطار بھی کرو' نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔''

دینداری اور خدا پرستی کا یہ کمال نہیں کہ عزلت نشینی اور قطع تعلق کا طریق اپنا لیا جائے اور دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے کسی غار یا کھوہ میں بیٹھ کر طمانیت حاصل کی جائے' اسلام نے اسے رہبانیت سے موسوم کیا ہے۔ اسی طرح اسلام نے غیر ضروری ریاضتوں سے بھی منع کیا ہے اور بلا وجہ اپنے آپ کو ایذا پہنچانے اور محنت شاقہ سے اپنے آپ کو تکلیف دینے کو ناپسند فرمایا۔ یونانی فلسفیوں میں اشراقیت' عیسائیوں میں رہبانیت اور ہندوؤں میں جوگ اسی تصوّرِ عبادت کا شاخسانہ تھا۔ اسلام سے پہلے نبی کریم ﷺ غور وفکر اور سوچ بچار کے لیے غار حرا میں کئی کئی دن قیام فرماتے تھے' مگر جب وحی کا پیغام آپؐ کے پاس آیا تو پھر گوشۂ عزلت کو آپؐ نے چھوڑ دیا۔ ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَاَنْذِرْ ② وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ③﴾ کے مصداق آپؐ کے شب وروز دین کو قائم کرنے کی سعی وجدّ وجُہد میں گزرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا:

((لَا تُشَدِّدُوْا عَلٰی اَنْفُسِكُمْ فَیُشَدَّدَ عَلَیْكُمْ' فَاِنَّ قَوْمًا شَدَّدُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ فَشَدَّدَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ' فَتِلْكَ بَقَایَاهُمْ فِی الصَّوَامِعِ وَالدِّیَارِ))(۱)

''تم اپنی جانوں پر سختی نہ کرو ورنہ اللہ بھی تم پر سختی کر دے گا۔ بے شک وہ قومیں جنہوں نے اپنی جانوں پر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی' اور ان کی بقایا (نسلیں) آج گرجوں اور دیروں (راہب خانوں) میں ہیں۔''

اسلام نے انسانوں کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے آزاد کیا اور صرف خدائے واحد کی چوکھٹ پر سر جھکانے کا حکم دیا' ان کو ہر طرح کی افراط وتفریط سے بچایا۔ یہاں نہ تو رسولوں کو خدا کا بیٹا بنانے کی روش راہ پا سکی اور نہ اس کے سوا کسی دوسرے کی بندگی کو جواز مہیا ہو سکا۔ رسول کو رسول اور خدا کو حقیقی الٰہ بنائے رکھنے کا تصوّر اور عقیدہ قائم ودائم رہا۔ انہی حقائق کی روشنی میں قرآن میں کہا گیا کہ اُمتِ محمدیہ' اُمتِ وسط ہے۔ یہاں زندگی کے ہر شعبہ میں تناسب' توازن اور اعتدال تو ہے' مگر عدمِ توازن ہرگز نہیں۔

❁❁❁

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الادب' باب فی الحسد۔

اساطینِ علم کے ارباب اقتدار سے تعلقات (۳)

حافظ طاہر اسلام عسکری

⊙ عمرو بن حزمؓ کی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو نصیحت

امام ابن سیرینؒ کا بیان ہے کہ جب امیر معاویہؓ نے اہل مدینہ کو یزید کی بیعت کے حوالے سے خط بھیجا تو اس میں تحریر فرمایا کہ تمہارا کوئی امیر موجود نہیں' لہٰذا جو اپنے مسائل و ضروریات کے باب میں مجھ سے ملنا چاہے وہ میرے پاس آ سکتا ہے۔ چنانچہ عمرو بن حزمؓ اور ان کے بھائی عمارہ بن حزمؓ ان سے ملاقات کے لیے گئے۔ پہلے حضرت عمرو امیر معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کہا: اے معاویہؓ! آپ سے پہلے لوگوں کے بھی بیٹے تھے' مگر انہوں نے یہ اقدام نہیں کیا جو آپ کر رہے ہیں۔ آپ کا بیٹا بھی قریش کے دیگر جوانوں کی طرح ہے۔ یہ سن کر امیر معاویہؓ کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔ پھر فرمایا: ''تم جری شخص ہو اور اپنی رائے جتنی بیان کر سکتے تھے' تم نے بیان کر دی۔ بلاشبہ وہ میرا بیٹا ہے اور ان کے بھی بیٹے ہیں' مگر مجھے اپنا فرزند ان کے اَبناء کی نسبت زیادہ محبوب ہے۔ تم اپنی حاجت بیان کرو''۔ عمرو نے کہا: مجھے کوئی حاجت و ضرورت درپیش نہیں۔ یہ کہہ کر وہاں سے پلٹ آئے۔ راستے میں بھائی عمارہ سے ملاقات ہوئی تو انہیں ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔ عمارہ کہنے لگے: ''اناللہ' کیا ہم مدینہ سے اس قدر طویل مسافت محض اس لیے طے کر کے آئے ہیں؟'' عمرو نے کہا: ''تم خود ان کے پاس چلے جاؤ''۔ ابھی دونوں بھائیوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ امیر معاویہؓ کا پیامبر آن پہنچا اور عمارہ سے پوچھا کہ تمہاری اور تمہارے بھائی کی ضرورت کیا ہے؟ انہوں نے ضرورت و حاجت بتائی جو اُسی وقت پوری کر دی گئی۔ (۴۱)

⊙ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل

امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سلطان کے پاس جاتے اور اس سے میل جول رکھتے تھے لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تقاضوں کا خیال بھی رکھتے تھے۔ آپؒ ان لوگوں کو ہدفِ تنقید بناتے تھے جو محض تعلقات بنانے کے چکروں میں ایوانِ اقتدار کے پھیرے لگاتے رہتے تھے اور حق گوئی اور اصلاحِ احوال کے اوصاف سے محروم تھے۔

علامہ ذہبیؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک دن حسن بصریؒ ابن ہبیرہ سے ملاقات کر کے باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ دروازے پر کچھ قراء (علماء) بیٹھے ہیں۔ آپ نے ان کی سخت فہمائش کی۔ فرمایا:

''تم لوگ یہاں کس لیے بیٹھے ہو؟ کیا ان خبیثوں کے پاس جانا چاہتے ہو؟ خدا کی قسم! ان کی مجالس نیک لوگوں کے لائق نہیں۔ چلے جاؤ اور جدا ہو جاؤ' خدا تمہاری روحوں کو تمہارے جسموں سے جدا کرے۔ تم نے اپنے جوتے چوڑے کر لیے' اپنے لباس سمیٹ لیے اور بال کاٹ لیے ہیں۔ تم نے قراء کو بدنام کر دیا ہے' اللہ تمہیں رسوا کرے۔ اگر تم ان کے مال و دولت اور عہدہ و منصب سے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے تو یہ تمہارے علم و معرفت کی رغبت و جستجو کرتے۔ لیکن تم نے اس شے میں دلچسپی ظاہر کی جو ان کے پاس تھی' لہٰذا وہ تمہارے پاس موجود چیز سے مستغنی ہو گئے۔ جو علم و تقویٰ سے دور ہے اللہ تعالیٰ اُسے اپنی رحمت سے دور کر دے''۔[٤٢]

⊙ حیوبہ بن شریح رحمۃ اللہ علیہ کی حکام کو نصیحت

آپ والیٔ مصر کو مسلح لشکر تشکیل دینے کی ہدایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہماری اولادوں کو اسلحہ اور ہتھیاروں سے لیس کرو' انہیں نہتا نہ رہنے دو کہ ہم متعدد دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ایک طرف قبطی ہیں جو نجانے کب بدعہدی کر کے ہم پر دھاوا بول دیں' دوسری جانب اہل حبشہ ہیں' نامعلوم وہ کب حملہ آور ہو جائیں۔ پھر رومی ہیں' اندیشہ ہے کہ وہ ہماری سرحدوں میں اتر آئیں اور بربری ہیں' جن کا کوئی پتا نہیں کہ کب جنگ وجدل پر اتر آئیں''۔

☆ <u>ایک حقیقت کی توضیح اور غلط فہمی کا ازالہ</u> : ایک جلیل القدر عالم ربانی کی اربابِ حل و عقد کو اس نصیحت سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ جہاں اسلامی فکر و عقیدہ اور اعمال و عبادات میں در آنے والی خرابیوں کی اصلاح اہل علم کا فریضہ ہے وہیں یہ بھی علماء کی ذمہ داریوں

میں شامل ہے کہ وہ ان تمام امور و معاملات پر نظر رکھیں جو اسلام و اہل اسلام کے مصالح سے متعلق ہیں اور اس حوالے سے بھی اصحابِ اقتدار کی کوتاہیوں اور لغزشوں پر انہیں متنبہ کرتے رہیں' جیسا کہ حیوۃؒ نے حاکم مصر کو ایسے معاملے کی طرف متوجہ کیا جو بظاہر عقائد و عبادات کے محدود سانچوں سے باہر نظر آتا ہے۔ اسی سے یہ غلط فہمی بھی دور ہو جانی چاہیے جو آج کل کے ''پڑھے لکھے'' لبرل حلقوں میں پائی جاتی ہے کہ دین و مذہب کا دائرہ محض عقیدہ و عبادات اور چند مخصوص عائلی و شخصی معاملات تک ہی محدود ہے اور امور سیاست و ریاست دین کے دائرے سے باہر کی چیزیں ہیں' فلہٰذا مولویوں کو اس میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں!! واقعہ یہ ہے کہ یہ مغالطہ دین کے غلط تصور کی بنا پر اُبھرا ہے۔ اسلام کی رو سے ہر وہ مسئلہ جس کا تعلق مصالح انسانی سے ہے' دین کا جزو ہے اور مقاصدِ شریعت میں شامل ہے۔ اس لیے علماء کو اس کی اصلاح و تنقید کا حق حاصل ہے' جیسا کہ سلف صالحین کے طرزِ عمل سے عیاں ہے' جس کا ثبوت حضرت حیوۃ کی مندرجہ بالا نصیحت سے بھی ملتا ہے۔

⊙ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا حکمرانوں سے برتاؤ

امام دار الہجرۃ مالک بن انسؒ کا حکام کے پاس آنا جانا رہتا تھا۔ اس بنا پر بعض بزرگوں نے آپؒ پر تنقید کی' جن میں عبداللہ بن عبدالعزیزؒ العمری الزاہدؒ اور یحییٰ بن یزید النوفلیؒ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ العمریؒ نے آپ کو اور ابن ابی ذئب (جن کا تذکرہ سطور بالا میں گزر چکا ہے) کو خط لکھا:

> ''آپ ایسے علماء ہیں جو دنیا کی طرف میلان رکھتے ہیں' آپ نرم اور بڑھیا لباس زیب تن کرتے ہیں اور زہد و تقشف کو آپ نے چھوڑ رکھا ہے''۔ (۴۳)

امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ اس کے جواب میں ابن ابی ذئبؒ نے تو العمریؒ کو سخت خط لکھا لیکن امام مالکؒ نے وہ جواب دیا جو واقعتاً ایک عالم اور فقیہ کے شایانِ شان ہے۔ آپؒ نے ابن ابی ذئب کی سختی و شدت کی وجہ سے انہیں ہلکا یا قابل مذمت نہیں سمجھا۔ امام صاحبؒ کے جوابی مکتوب کا مضمون یہ تھا:

> ''بلاشبہ اللہ عزوجل نے جس طرح رزق کی تقسیم میں تنوع رکھا ہے' اسی طرح اعمال میں مختلف نوعیتوں کی تقسیم فرمائی ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کو نماز کا خصوصی ذوق عطا ہوتا ہے مگر روزہ میں ان کی زیادہ رغبت نہیں ہوتی۔ اسی طرح کچھ لوگوں کو صدقہ و خیرات کی

توفیق ارزانی ہوتی ہے اور بعض کو جہاد وقتال مرغوب ہوتا ہے۔ علم کی نشرواشاعت بھی افضل ترین نیکی ہے اور مجھے اس کی جو توفیق مرحمت ہوئی ہے میں اس پر خوش اور مطمئن ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میرا شعبہ آپ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں اور مجھے اُمید ہے کہ ہم دونوں ہی خیر و بھلائی کی راہ پر گامزن ہیں''۔(٤٤)

☆ یحییٰ بن یزید النوفلیؒ کا خط امام مالکؒ کے نام: النوفلی نے امام صاحبؒ کو نصیحت و خیر خواہی پر مبنی جو خط لکھا' اس کے مندرجات یہ تھے:

''مجھے معلوم ہوا کہ آپ باریک لباس پہنتے اور پُرتکلف غذا کھاتے ہیں' نرم بچھونے پر بیٹھتے ہیں اور اپنے دروازے پر دربان مقرر کر رکھا ہے۔ دیکھئے آپ مجالسِ علم آراستہ کرتے ہیں' جس کی بنا پر لوگ دور دراز سے سفر کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ آپ ان کے ہاں درجہ امامت پر فائز ہیں اور آپ کے اقوال وفتاویٰ کو ان میں قبولِ عام حاصل ہے' لہٰذا آپ اللہ تعالیٰ سے ڈریے اور تواضع اختیار کیجیے۔ میں نے آپ کو اپنی جانب سے خیر خواہی کی یہ جو تحریر لکھی ہے' اسے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا' والسلام۔''

☆ مکتوب مالکؒ بنام یحییٰ بن یزیدؒ: امام مالکؒ نے اس کے جواب میں انہیں درج ذیل مکتوب بھیجا:

'' بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مالک بن انس کی جانب سے یحییٰ بن یزید کے نام

سلام علیک! امابعد' مجھے آپ کا خط ملا' جو میرے لیے ایک مشفق و ناصح کی نصیحت پر مبنی ہے' اللہ تعالیٰ آپ کو تقویٰ کی نعمت سے بہرہ یاب فرمائے' نصیحت و خیر خواہی کرتے رہنے کی توفیق دے اور جزائے خیر عطا فرمائے۔ میں اللہ تعالیٰ سے توفیق ہدایت کا طالب ہوں کہ نیکی کرنے کی طاقت اور برائی سے بچنے کی ہمت محض خدائے بزرگ و برتر ہی کی عطا سے ممکن ہے۔ اور یہ جو آپ نے ذکر کیا ہے کہ میں لباس وغذا میں تکلف وعمدگی ملحوظ رکھتا ہوں اور نرم فرش پر بیٹھتا ہوں تو بجا فرمایا' لیکن ہم اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے بخشش ومغفرت کی التجا بھی کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ﴾ (الاعراف:٣٢) ''آپؐ ان سے پوچھئے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے لیے جو زینت اور کھانے (پینے) کی پاکیزہ چیزیں پیدا کی ہیں' ان چیزوں کو کس نے حرام کیا ہے؟'' مجھے یہ بھی معلوم ہے

کہ ان چیزوں سے اجتناب اور انہیں ترک کرنا' ان کے اختیار کرنے سے بہر حال بہتر وافضل ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس خط و کتابت کا سلسلہ منقطع نہ فرمائیے گا' ہم بھی اسے جاری رکھیں گے' والسلام"۔

◆ اسی طرح جب امام مالکؒ سے کہا جاتا کہ آپ خلیفہ کے پاس جاتے ہیں تو فرماتے: اگر یہ سلسلہ ترک کر دیا جائے تو اصلاح و تنقید اور نصح و خیر خواہی کا فریضہ کیونکر سرانجام دیا جا سکتا ہے! چنانچہ آپ کی ایوانِ اقتدار میں آمد و رفت کی نوعیت عزت و اجلال اور نصح و ارشاد کی تھی' جاہ و شہرت اور متاعِ دنیا اس سے مقصود نہ تھی۔ علامہ ذہبیؒ نے امام صاحبؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اللہ کی قسم! میں دنیا کے ان بادشاہوں میں سے جس کے پاس بھی گیا ہوں' اللہ نے اس کا رُعب و ہیبت میرے سینے سے سلب کر لیا۔ یعنی میں کبھی کسی سے مرعوب و متاثر نہیں ہوا"۔ (۴۵)

حضرت الامام کی یہ بات بالکل درست ہے' جیسا کہ درج ذیل واقعات سے معلوم ہوتا ہے:

◆ ہارون الرشید اپنے بیٹوں کے ہمراہ امام مالکؒ کے گھر حاضر ہوا اور گزارش کی کہ آپ ہم پر حدیث کی قراءت فرمائیں۔ آپؒ نے فرمایا مدت ہوئی میں نے کسی کے سامنے نہیں پڑھا' البتہ لوگ مجھ پر قراءت کرتے ہیں' یعنی وہ حدیث پڑھتے ہیں اور میں سنتا ہوں۔ ہارون کہنے لگا: اچھا تو دوسرے لوگوں کو یہاں سے نکال دیجیے' ہم حدیث کی قراءت کریں۔ امام صاحبؒ نے اس کا یہ پُروقار جواب دیا: "جب خواص کی خاطر عوام کو محروم رکھا جائے تو خواص بھی انتفاع و استفادہ سے محروم رہتے ہیں"۔ (۴۶)

◆ خلیفہ مہدی' مدینہ آیا اور ہارون و موسیٰ سے کہا کہ امام مالکؒ سے حدیث و آثار کی سماعت کرو۔ انہوں نے بجائے خود جانے کے' امام صاحب کو بلا بھیجا مگر آپؒ تشریف نہ لائے۔ مہدی کو بتلایا گیا تو اس نے حضرت الامام سے بات کی۔ آپؒ نے فرمایا: "امیر المؤمنین! حصولِ علم کی خاطر' اہلِ علم کے پاس جایا جاتا ہے نہ کہ علماء کو بلایا جاتا ہے"۔ مہدی نے کہا کہ انہوں نے درست فرمایا' لہٰذا تم دونوں ان کی خدمت میں حاضری دو۔ چنانچہ وہ گئے اور ان میں سے ایک نے بڑے ادب سے کہا: جناب آپ حدیث کی قراءت فرمائیے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا: "اہل مدینہ عالم کے سامنے یوں پڑھتے ہیں جیسے بچے معلم کے سامنے' جب وہ غلطی کرتے ہیں تو عالم ان کی اصلاح کر دیتا ہے"۔ (۴۷)

◆ یہ حکام کو علمائے حق کی مفید اور قیمتی پند و نصائح کے چند نمونے ہیں' جن سے یہ امر واضح ہو کر فکر و نظر کے سامنے آتا ہے کہ ان حکمرانوں کے پاس جانے میں کوئی حرج نہیں جو

اصلاحِ احوال اور قبولِ خیر و نصیحت کا جذبہ رکھتے ہیں‘ البتہ اس باب میں اوپر بیان کردہ شرائط کا لحاظ ضروری ہے۔ رہے ظالم و مستبد اور جابر و فاجر اربابِ اقتدار تو ان کے درباروں میں آنا جانا‘ درست نہیں‘ اِلا یہ کہ جانے والے کو یقین ہو کہ وہ وہاں آوازِ حق بلند کر سکے گا اور فریضۂ امر و نہی کی بجا آوری اس کے لیے ممکن ہے۔

جہاں تک شاہی عطیات و انعامات قبول کرنے کا مسئلہ ہے تو علمائے سلف کا وہ گروہ جو حکمرانوں سے دور رہنے کی پالیسی کو مناسب سمجھتا ہے وہ عطیات کے حوالے سے بھی عدم قبول کی تلقین کرتا ہے۔ خود ان کے طریقِ عمل سے بھی اسی کا پتا چلتا ہے کہ وہ حکمرانوں کے عطیات نہ اپنی ذات کے لیے لیتے اور نہ اپنے احباب و تلامذہ اور اولاد و اعزہ کو لینے دیتے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اس باب میں بہت سخت تھے‘ حتیٰ کہ وہ اس بات سے بھی اجتناب و گریز کرتے تھے کہ لوگوں میں سرکاری مال تقسیم ہی کر دیں۔ انہوں نے صرف ایک مرتبہ یہ ڈیوٹی نبھائی اور وہ بھی اس شان سے کہ وہ تھیلی بھی راہِ خدا میں صدقہ کر دی جس میں درہم و دینار لائے گئے تھے اور اس میں سے اپنی اولاد کو ایک رتی بھی نہ دی۔

البتہ بعض علماء حکام و سلاطین کے بھیجے ہوئے تحفے اور عطیات قبول کر لیتے تھے۔ اس سلسلہ میں اصل یہ ہے کہ اگر بغیر سوال کے کوئی ہدیہ و تحفہ آ جائے اور یہ معلوم ہو کہ وہ مالِ حرام یا غصب شدہ نہیں تو اسے لینا درست ہے‘ سلامتی اگرچہ اسی میں ہے کہ اس سے بھی پرہیز ہی کیا جائے‘ واللہ اعلم!

خلاصۂ بحث

سطورِ بالا میں اہل علم کے اصحابِ اقتدار سے تعلقات کے باب میں جو متنوع طرز ہائے فکر و عمل بیان ہوئے ہیں‘ ان کا حاصل یہ ہے کہ جن علماء نے حکمرانوں سے میل جول اور ان کے ہاں آمد و رفت سے گریز اور دامن کشاں رہنے کی رائے اپنائی‘ انہوں نے احتیاط و سلامتی کا راستہ اپنایا اور حبِ جاہ و شہرت اور فتنوں سے اپنے کو بچا لیا۔ بخلافِ ازیں جو علماء ایوانِ اقتدار و حکومت میں جانے کو درست سمجھتے تھے ان کے پیش نظر ارشاد و ہدایت اور نصح و خیر خواہی کے فریضے کی ادائیگی تھی۔ اور دیکھا جائے تو ایک پہلو سے یہ راہِ عزیمت ہے کہ اس میں انتہائی جرأت و استقامت کی ضرورت ہوتی ہے‘ نیز ہر دم خطا و لغزش اور ابتلاء و فتنہ کا خطرہ درپیش رہتا ہے۔

اس تحریر سے مقصود یہ ہے کہ اصحابِ علم و ہنر اپنی ذمہ داریوں اور مقام و منصب کا احساس

کریں‘ علمِ دین کی قدر کریں‘ حکام و امراء کے دروازوں پر جانے کے بجائے خود داری اور عزتِ نفس کو ملحوظ رکھیں‘ حق گوئی‘ بے باکی‘ بے خوفی اور جرأت و شجاعت کو اپنا شعار بنائیں‘ کہ علم دین اور اہل علم کا وہ مقام و مرتبہ اور شان و شوکت بحال ہو سکے جو بوجوہ آج چھن چکا ہے۔

حضراتِ علماء کرام سے گزارش ہے کہ وہ قائل کو نہ دیکھیں کہ اسے اپنی بے مائیگی اور بے بضاعتی کا پورا احساس ہے اور اس حقیقت سے بھی باخبر ہے کہ وہ علماء سے خطاب کا اہل نہیں۔ تاہم اس جسارت کا حوصلہ محض اس لیے ہوا کہ شاید اصلاحِ احوال کے باب میں اس سے کوئی پیش رفت ہو سکے۔ سچ یہ ہے کہ معاشرے میں علم و علماء کی عزت و سربلندی محض اسی صورت میں ممکن ہے جب مسانیدِ علم و ارشاد پر متمکن اصحاب فکر و دانش اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ آخر میں سلف کے ایک بزرگ کا اس باب میں تجزیہ پیش خدمت ہے‘ جس سے یہ حقیقت بے غبار ہو کر سامنے آ جائے گی:

> ”ابو حازمؒ کا بیان ہے کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک مدینے آیا تو دربار میں فقہاء جمع ہوئے۔ زہریؒ میرے قریب بیٹھے تھے‘ کہنے لگے‘ کوئی اچھی بات سنایئے۔ میں نے کہا: ”تو سنو‘ اگلے فقہاء و علماء اپنے علم کے مقابلے میں دنیاداروں کی پروانہیں کرتے تھے اور ان سے مستغنی رہا کرتے تھے۔ اسی لیے دنیاداران کی عزت کرتے اور ان سے تقرب میں اپنی عزت سمجھتے تھے۔ مگر آج علماء و فقہاء کی حالت دوسری ہے۔ انہوں نے دنیا کی طمع میں اپنے علم کو دنیاداروں کی خوشامد و خدمت پر وقف کر دیا ہے۔ دنیاداروں نے خود علماء میں علم کی یہ بے قدری دیکھی تو خود بھی علم کو حقیر سمجھنے لگے اور اپنی دنیا پر اور زیادہ فریفتہ ہو گئے“۔(۴۸)

[ق]تادہؒ فرماتے تھے:

> ”بدترین حاکم وہ ہیں جو علماء سے دور رہتے ہیں اور بدترین علماء وہ ہیں جو حکام سے نزدیک رہتے ہیں“۔(۴۹)

باری تعالیٰ علمائے ربانی کو حق پر جرأت و استقامت سے کاربند رہنے کی توفیق مرحمت [فر]مائے اور ہمیں علمائے سُوء کے شر و نحوست سے محفوظ رکھے۔ آمین یا ربّ العالمین!

[حو]اشی

(۱) جامع بیان العلم لابن عبد البر‘ ج ۱‘ ص ۲۶۶۔ (۲) ایضاً۔

(۳) سنن ابی داوٗد‘ ح ۲۹۳۲۔ بتخریج الالبانیؒ۔ (۴) سنن ابی داوٗد‘ ح ۳۶۴۱۔

(٥) کنز العمال' ح ٢٨٦٧٩٠۔ (٦) السلسلة الضعيفة : ٣٩٥٢۔
(٧) جامع الاصول لابن الا ثیر' ٧٩۔
(٨) الآداب الشرعية لابن مفلح' ج٢' ص ٥٤۔ (٩) کنز العمال' ج١٠' ص ٣٠٨۔
(١٠) زاد المسیر لابن جوزی' ج٦' ص ٤٨٦۔ (١١) تفسیر القرطبی' ج١٤' ص ٣٤٣۔
(١٢) الفقیه والمتفقه للخطیب البغدادی' ج٢' ص ٤٨۔
(١٣) سنن ابن ماجه' ح٢٥٤ وصحیح ابن حبان' ٧٧۔
(١٤) سنن ابی داوٗد' ح٣٦٦٤۔ (١٥) صحیح مسلم' ح٣٥٢٧۔
(١٦) سنن الدارمی' رقم ٢٩٩' واسناده صحیح۔ (١٧) جامع بیان العلم' ج١' ص ٦٦٦۔
(١٨) شعب الایمان للبیهقی ج٢' ص ٢٩٦۔ (١٩) فیض القدیر' ج٢' ص ٥٣١۔
(٢٠) سنن ابی داوٗد' ح٢٧٥٩ و سنن الترمذی' ح٢٢٥٦۔
(٢١) صحیح مسلم' ح١٨٥٤۔ (٢٢) مصنف عبدالرزاق' ج١١'ص ٣١٦۔
(٢٣) سیر اعلام النبلاء : ج٢٣' ص ٥٨٦۔ (٢٤) سیر اعلام النبلاء' ج٧' ص ٢٤٤۔
(٢٥) جامع بیان العلم:
(٢٦) تاریخ بغداد للخطیب بغدادی' ج٩' ص ١٥٩۔
(٢٧) *حکومت اور علمائے ربانی از محدث روپڑی*' ص ٧ تا ١٠' طبع جدید۔
(٢٨) سیر اعلام النبلاء للذهبی' ج٥' ص ٤١۔ (٢٩) ایضاً۔
(٣٠) العلم والعلماء *اردو ترجمہ* جامع بیان العلم از عبدالرزاق ملیح آبادیؒ' ص ١٢٣۔
(٣١) الآداب الشرعية' ج٣' ص ٤٥٨۔ (٣٢) سیر اعلام النبلاء' ج٩' ص ١٤٤۔
(٣٣) *حکومت اور علمائے ربانی*' ص ٣٦۔ (٣٤) *حکومت اور علمائے ربانی*' ص٣٨تا ٤٠۔
(٣٥) مسند احمد' ج٢' ص ٦٩۔
(٣٦) جامع بیان العلم' ج١' ص ٦٤٤۔ مترجم' ص ١٢٧۔
(٣٧) الآداب الشرعية لابن مفلح' ج٣' ص ٤٥٨۔
(٣٨) تهذیب الکمال للمزی' ج٢٠' ص ٨١۔
(٣٩) سیر اعلام النبلاء' ج٧' ص ١٤٠۔ (٤٠) سیر اعلان النبلاء' ج٧' ص ١٤٤۔
(٤١) سیر اعلام النبلاء' ج٧' ص ١٤۔
(٤٢) تاریخ دِمشق لابن عساکر' ج٤٥' ص ٣٧٧۔
(٤٣) سیر أعلام النبلاء : ج٨' ص ٣٧٤۔ (٤٤) التمهید لابن عبدالبر' ج٧' ص ١٨٥۔
(٤٥) سیر أعلام النبلاء : ج٨' ص ٦٦۔ (٤٦) ایضاً۔
(٤٧) سید اعلام النبلاء' ج٨' ص ٦٣۔ (٤٨) جامع بیان العلم' (مترجم) ص ١٣٠۔
(٤٩) ایضاً' ص ١٢٧۔

جدید مساوات یا عدلِ اسلامی؟

محمد عمران صدیقی

'جاہلیتِ جدیدہ' کی بنیادی اقدار میں 'آزادی' کے بعد 'مساوات' کا نام لیا جاتا ہے۔ سننے کی حد تک یہ ایک خوبصورت لفظ اور دل لگتی اصطلاح ہے یعنی 'برابری' تسویہ' لیکن اپنی اصلیت اور حقیقت میں یہ اسلام کی بنیادی قدر 'عدل' کی نفی اور فرقِ مراتب کی ضد ہے۔ مسلمانوں کے بعض مفکرین اور دانشور جو 'جاہلیت' ہی کی خوشہ چیں بن کر رہ گئے ہیں' اس مغربی قدر کو مغربی جانتے ہوئے بھی مسلمانوں کے سر تھوپنا چاہتے ہیں' جبکہ کئی سادہ لوح 'مساوات' کو 'اسلامی قدر' کے طور پر جانتے ہیں اور اسی حیثیت سے منوانا چاہتے ہیں۔

'مساوات' (Equality) تمام انسانوں کی برابری کا تصوّر دیتی ہے۔ یعنی انسانوں کی معاشی' سیاسی' سماجی' مذہبی' فکری' صنفی ہر اعتبار سے برابری کا تصوّر اور اس کا انسان کے بنیادی حق ہونے کی حیثیت میں متبرک ہونا۔ 'مذہبی' اعتبار سے کوئی کافر ہے یا مسلمان' مشرک ہے یا موّحد' اہلِ کتاب ہے یا اہلِ الحاد' 'مساوات' ان افراد کو برابری کا درجہ دے گی اور مذہب کے فرق کی بنا پر ان کے مابین کسی قسم کا امتیاز نہ برتا جائے گا۔ جبکہ اسلام 'عدل' کا دین ہے اور عدل کے مقابل ظلم کا لفظ آتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ مذہبی اعتبار سے تمام انسانوں کو برابری کا درجہ دینا ایک 'ظلم' ہے جسے آج کی جاہلیت 'مساوات' کا نام دیتی ہے۔

قرآن مجید میں کہیں بھی مسلمانوں کو مساوات کا درس نہیں دیا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے 'عدل' کا حکم دیا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾ (النحل:۹۰)

''اللہ تم کو انصاف کا حکم دیتا ہے۔''

﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ﴾ (الشوریٰ:۱۵)

''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے مابین عدل کروں۔''

الشیخ محمد بن صالح العثیمین شرح العقیدۃ الواسطیۃ میں لکھتے ہیں:

وَهُنَا يَجِبُ أَنْ نُنَبِّهَ عَلٰى اَنَّ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَسْتَعْمِلُ بَدْلَ الْعَدْلِ: الْمُسَاوَاةُ ' وَهٰذَا خَطَأٌ ' لَا يُقَالُ مُسَاوَاةٌ لِاَنَّ الْمُسَاوَاةَ قَدْ تَقْتَضِى التَّسْوِيَةَ بَيْنَ شَيْئَيْنِ ' وَالْحِكْمَةُ تَقْتَضِى التَّفْرِيْقَ بَيْنَهُمَا

''یہاں یہ تنبیہہ کر دینا ہم پر لازم ہے کہ بعض لوگ 'عدل' کے بدلے 'مساوات' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جبکہ یہ صریح غلطی ہے۔ پس 'مساوات' کی اصطلاح 'عدل' کی جگہ پر استعمال نہیں کی جا سکتی' کیونکہ 'مساوات' دو چیزوں کے درمیان برابری کا تقاضا کرتی ہے' جبکہ 'حکمت' انہی دو چیزوں کے درمیان جدا جدا حیثیت کا تقاضا کرتی ہے۔''

الشیخ محمد بن صالح العثیمین مزید لکھتے ہیں:

وَلِهٰذَا كَانَ اَكْثَرُ مَاجَاءَ فِى الْقُرْآنِ نَفْيَ الْمُسَاوَاةِ

''اس لیے قرآن کریم میں اکثر و بیشتر مساوات کی نفی کا ہی تذکرہ آیا ہے۔''

﴿هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ﴾ (الزمر:٩)

''کیا علم رکھنے اور نہ رکھنے والے برابر ہو سکتے ہیں؟''

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ﴾ (الرعد:١٦)

''پوچھو! کیا نابینا اور بینا یا اندھیرا اور اُجالا برابر ہو سکتا ہے؟''

﴿لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ﴾ (الحدید:١٠)

''جس شخص نے تم میں سے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور لڑائی کی وہ (اور جس نے یہ کام بعد میں کیے وہ) برابر نہیں۔ ان کا درجہ ان لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے جنہوں نے بعد میں خرچ (اموال) اور (کفار سے) جہاد و قتال کیا۔''

﴿لَا يَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ﴾ (النساء:٩٥)

''عذر والوں کے علاوہ جو مسلمان (گھروں میں) بیٹھ رہتے (اور لڑنے سے جی چراتے) ہیں اور جو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے لڑتے ہیں' وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔''

الشیخ محمد بن صالح العثیمین مزید کہتے ہیں:

وَأَخْطَأَ عَلَى الْإِسْلَامِ مَنْ قَالَ: إِنَّ دِينَ الْإِسْلَامِ دِيْنُ الْمُسَاوَاةِ بَلْ دِيْنُ الْإِسْلَامِ دِيْنُ الْعَدْلِ۔ وَهُوَ الْجَمْعُ بَيْنَ الْمُتَسَاوِيَيْنِ، وَالتَّفْرِيْقُ بَيْنَ الْمُفْتَرِقَيْنِ، اِلَّا اَنْ يُّرِيْدَ بِالْمُسَاوَاةِ: الْعَدْلَ، فَيَكُوْنَ أَصَابَ فِي الْمَعْنٰى وَ أَخْطَأَ فِي اللَّفْظِ

''جو شخص دینِ اسلام کو مساواتی دین کہتا ہے اس نے اسلام کی بابت غلطی کھائی ہے' کیونکہ اسلام تو دینِ عدل ہے' اور عدل دو برابر چیزوں کو اکٹھا کرنے اور دو مختلف چیزوں کو جدا جدا کرنے کا نام ہے۔ ہاں اگر وہ مساوات بول کر عدل مراد لے رہا ہے تو یہ معناً صحیح ہے لیکن لفظاً غلط ہے۔''

'مساوات' کا سبق پڑھانے والے توحید و شرک' حق و باطل اور خیر و شر میں کسی تفریق کے قائل نہیں۔ ان کی نظر میں ہر وہ عقیدہ اور نظریہ جسے کوئی انسان قبول کر لے' برابر اہمیت اور حیثیت رکھتا ہے اور کسی بھی عقیدہ کی بنا پر انسانوں کے مابین کوئی تفریق کرنا بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور جرم ہے۔ جبکہ اسلام عقیدہ و ایمان کی بنیاد پر انسانیت کو دو واضح گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک اہلِ ایمان' اہلِ توحید اور انبیاءؑ کے سچے پیروکار جنہیں عباد اللہ' عباد الرحمٰن' مؤمنین' مسلمین اور حزب اللہ جیسے الفاظ سے پکارا جاتا ہے اور دوسرے اہلِ شرک' کفار و منافقین اور درہم و دینار کے پجاری' جنہیں حزب الشیطان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اول الذکر اہلِ حق ہیں' دنیا میں ہدایت اور آخرت میں نجات پانے والے اور ثانی الذکر دنیا میں گمراہ اور آخرت میں عذابِ الٰہی کے حق دار۔ اب یہ دونوں فریق 'مساوی' کیسے ہو سکتے ہیں؟ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ﴿۳۵﴾﴾ (القلم)

''کیا ہم فرماں برداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟''

اول الذکر مسلمانوں کی محبت' دوستی اور ولاء کے حق دار جبکہ ثانی الذکر مسلمانوں کی براءت' دشمنی اور بغض کے مستحق ہیں۔

پھر جاہلیت کے علم بردار اسی 'مساوات' کو 'صنفی' تفریق مٹانے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں کہ مرد اور عورت مساوی ہیں لہٰذا انہیں برابر حقوق حاصل ہونے چاہئیں' عورت کو

مرد کے شانہ بشانہ کارگاہِ عمل میں اُترنا چاہیے' زندگی کے ہر شعبے میں عورت کا کردار ہونا چاہیے۔ چادر اور چار دیواری پرانے دور کی باتیں ہیں' شرم و حیا رجعت پسندی کی یادگاریں ہیں۔ اگر مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے تو عورت کو بھی چار کی اجازت ہونی چاہیے ورنہ مرد و عورت دونوں کو صرف ایک شادی کی اجازت ہونی چاہیے' مرد نبی ہو سکتا ہے تو عورت کیوں نہیں؟ مرد سربراہِ مملکت بن سکتا ہے تو عورت کیوں نہیں؟

اس 'صنفی' مساوات کی دلیل نہ کسی نبی کے صحیفے سے ہے نہ عقلِ سلیم کے وظیفے سے' بلکہ کچھ اہواء و ظنون ہیں' شہوات و شبہات ہیں' خواہشاتِ نفس اور توہماتِ عقل ہیں' شیطانی وسوسے ہیں' علمِ وحی سے بغاوت ہے' تعلیماتِ انبیاء سے سرکشی اور عبدیت و بندگی سے اعراض ہے۔

اسلام ہر دو اصناف مرد اور عورت کے مابین انسان ہونے کے ناطے سے کوئی فرق اور امتیاز روا نہیں رکھتا بلکہ دونوں کو ایک ہی نفس کا جوڑا قرار دیتا ہے۔

﴿یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۚ﴾ (النساء:۱)

''اے انسانو! اپنے پروردگار کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے پھیلائے بہت سے مرد اور عورتیں۔''

﴿وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ۭ﴾ (الروم:۲۱)

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے پیدا کیں تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں تاکہ تم سکون حاصل کرو اُن کے پاس اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔''

لہٰذا جس طرح کوئی بھی مرد اللہ کی مخلوق ہے اسی طرح عورت بھی اللہ کی مخلوق ہے' جس طرح مرد پر کچھ ذمہ داریاں اپنے خالق کی طرف سے عائد کی گئی ہیں اسی طرح عورت پر بھی عائد کی گئی ہیں' جس طرح مرد کے کچھ حقوق ہیں اسی طرح عورت کے بھی حقوق ہیں' اور جس طرح مرد قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے جوابدہ ہے اسی طرح عورت بھی اپنے عقیدہ و عمل میں اپنے رب کے سامنے جوابدہ ہو گی۔ مگر جس طرح عورت اور مرد کی خلقت میں فرق ہے اسی طرح ان کی ذمہ داریوں اور حقوق میں بھی بنیادی اور واضح فرق ہے۔ یہی عدل کا تقاضا ہے

اور یہی اسلام کی تعلیم ہے۔

'صنفی' حیثیت میں برابری کے اصول کو ثابت کرنے کے لیے اولاً تو کوئی دلیل نہیں دی جاسکتی بلکہ 'مساوات' کی قدر 'تثلیث پر ایمان کی طرح بلا دلیل قبول کی جاتی ہے اور اسے ناقابلِ بحث قرار دیا جاتا ہے۔ ثانیاً دلیل دی بھی جاتی ہے تو انتہائی بودی' بے وقعت اور بے بنیاد کہ جس طرح گاڑی چلنے کے لیے پہیوں کا کردار مساوی ہے اسی طرح انسانی زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے مرد اور عورت دو پہیّوں کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اب غور کیجیے کہ یہ مثال اپنی بنیاد میں ہی غلط ہے' کیونکہ گاڑی کے دونوں پہیے اپنی خلقت میں ایک جیسے ہوتے ہیں جبکہ مرد اور عورت اپنی تخلیق میں ہی مختلف پیدا کیے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ مثال بے محل ہے بایں طور کہ مثّل اور ممثّل علیہ میں مطابقت ہی نہیں ہے۔ اس لیے صحیح تمثیل یہ ہوگی کہ مرد اور عورت گاڑی کے دو اہم پرزے ہیں جو اپنی خلقت میں مختلف ہونے کے باوجود زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے مساوی اہمیت رکھتے ہیں لیکن اپنا اپنا مختلف کردار بھی۔ یقیناً دونوں میں سے کسی ایک صنف کی غیر موجودگی میں زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی' مگر دونوں ایک ہی کردار ادا کرنے پر بضد ہوں تو بھی گاڑی تباہ ہی ہوگی۔ اگر ایک کے ذمّے ماں بن کر پیٹ میں بچے کو پالنا' سینے سے چمٹا کر دودھ پلانا اور پھر گود میں تربیت کرنا ہے تو دوسرے کے ذمّے باپ بن کر اس کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اور نگہبانی کا فرض ادا کرنا ہے۔

معاشی سرگرمیوں میں مختلف طبقوں کے لوگوں کے لیے ہر قسم کے پیشے سے مال کمانا 'مساوات' کی قدر کا جادو ہے۔ کوئی شراب بیچے یا چاول' سود اور جوئے کو آمدنی کا ذریعہ بنائے یا تجارت و صنعت کو' اسی طرح کوئی عورت جسم فروشی کا دھندہ اپنائے (تو اسے Sex worker کا نام دیا جائے) یا کوئی معلّمۂ ایمان و اخلاق بن جائے' تو دونوں 'مساوات' کی قدر کی بدولت مساوی حقوق اور احترام کی حق دار قرار پائیں گی!

اسلام ہر طرح کی معاشی سرگرمیوں کو 'مساوی' درجہ پر نہیں لاتا بلکہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے خانوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں اور ساری کائنات کا خالق و مالک ہے' اس لیے کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کا اختیار اُسی کے پاس ہے اور اس کے حکم کی اطاعت کرنا انسانوں کا اوّلین فرض بلکہ عبادت و بندگی ہے۔ اللہ کے حکم کو چھوڑ کر جس کسی کے حکم و قانون کی پیروی کی جائے' چاہے وہ کوئی فردِ واحد آمر و ڈکٹیٹر ہو' پیر و پنڈت یا اَحبار و

رُہبان ہوں یا عوام کی نمائندہ اسمبلی' یہ اسی کی بندگی کہلاتی ہے۔ اسلام نے شراب پینے اور بیچنے کو حرام قرار دیا اور دودھ و مشروبات کو حلال۔ سود' جوئے اور دھوکہ کو حرام قرار دیا اور تجارت و صنعت اور زراعت کو حلال۔ زنا و قحبہ گری کو حرام کیا' اسی طرح غیر اللہ کے نام پر ذبح' قربانی اور نذر و نیاز کو حرام ٹھہرایا۔ پس حرام اور حلال برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟ حرام ذرائع سے رزق کمانے والا' حلال ذرائع سے رزق کمانے والے کے برابر کیسے ہو سکتا ہے؟ سود کھانے اور کھلانے والا اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اعلانِ جنگ کا مرتکب' دنیا میں سزا اور آخرت میں عذاب کا حق دار جبکہ دیانت دار تاجر دنیا میں صاحب برکت اور آخرت میں نبی کا ساتھی ہوگا۔ ہر طرح کی معاشی سرگرمیوں کو برابر قرار دینا کفر ہے' ظلم ہے اور عدل کے منافی ہے۔ ایسی برابری' ایسا تسویہ' ایسی مساوات' اسلام کی نظر میں زیادتی اور حرام ہے۔

'مساوات' کی قدر سماجی اور سیاسی سطح پر بھی اپنے گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ سماجی سطح پر ہر طرح کا فرقِ مراتب مٹا دیا جاتا ہے۔ بڑے اور چھوٹے' نیک اور بد' عالم اور جاہل برابری کی حیثیت کے حامل قرار پاتے ہیں۔ جبکہ اسلام سماج کی سطح پر بھی فرقِ مراتب کا داعی ہے جس کا معیار تقویٰ قرار پاتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ ؕ﴾ (الحجرات:۱۳)

''تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔''

حضرت ابومسعود الانصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَؤُمُّ الْقَوْمَ أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ ، فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ، فَإِنْ كَانُوا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً، فَإِنْ كَانُوا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ سِنًّا)) (۱)

''قوم کی امامت وہ کرے جو قرآن زیادہ جانتا ہو۔ اگر قرآن میں برابر ہوں تو جو سنت زیادہ جانتا ہو۔ اگر سنت میں برابر ہوں تو جس نے پہلے ہجرت کی ہو۔ اگر ہجرت میں برابر ہوں تو جو عمر میں بڑا ہو۔''

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَيُوَقِّرْ كَبِيرَنَا)) (۲)

''جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے' وہ ہم میں

سے نہیں۔''

سیاست میں 'مساوات' One Man, One Vote کو جنم دیتی ہے۔کوئی پی ایچ ڈی ہے یا انگوٹھا چھاپ' کوئی انتہائی نیک و پرہیزگار ہے یا کمینہ و بدکردار' سب کی حیثیت 'مساوی' ہے' ہر کسی کو ایک ووٹ کا حق حاصل ہے۔کوئی کافر ہے یا مسلمان' مرد ہے یا عورت' پختہ عمر ہے یا نوجوان' ہماری جدید جاہلیت سب کو ایک آنکھ سے دیکھتی ہے۔(شاید دجال کی طرح دوسری آنکھ ہے ہی نہیں!)

'عبادت' میں بھی مساوات کی قدر کفر و اسلام اور شرک و توحید کو یکساں سطح پر لانے میں اپنا کردار خوب نبھاتی ہے۔کوئی بتوں کا پجاری ہو یا قبروں کا مجاور' کوئی جاہلیت کا نشان لٹکائے یا David Star' کوئی اللہ پروردگارِ عالم پر جان نچھاور کرے یا مٹی کی دھرتی پر مر مٹے' کوئی مرنے والے کے لیے دعا کرے یا ایک منٹ کی خاموشی اختیار کرے' موم بتی روشن کرے یا پھولوں کا گلدستہ رکھے' مراسم عبودیت بجالانے کو مسجد بنائے یا مندر تعمیر کرے' یا چرچ' پگوڈہ' ٹمپل' گوردوارہ کچھ بھی بنالے' جاہلیت جدیدہ کی نظر میں سب حق' سچ ہے اور بنیادی انسانی حقوق کے عین مطابق ہے' کوئی بھی جھوٹ' باطل نہیں۔چنانچہ اسلام اور غیر اسلام میں کوئی تفریق نہیں' اللہ تعالیٰ کے احکام اور مخلوق کی روایات سب برابر ہیں۔یہی 'مساوات' کا مفہوم ہے۔

یوں 'مساوات' اپنی حقیقت میں حق و باطل اور سچ و جھوٹ کو برابر کر دینے کا نام ہے' حفظِ مراتب اور فرقِ مراتب کو تباہ و برباد کر دینے کا نام ہے۔یہ ظلم ہے اور عدل کے منافی ہے۔جبکہ اسلام 'عدل' کا دین ہے' انصاف کو پسند کرتا ہے اور قسط کا حکم دیتا ہے۔حق اور اہلِ حق کو باطل اور اہلِ باطل پر' صدق اور اہلِ صدق کو کذب اور اہلِ کذب پر' اسی طرح خیر اور اہلِ خیر کو شر اور اہلِ شر پر ترجیح دیتا ہے اور اوّل الذکر کے لیے جنت اور اللہ کی رضا اور آخر الذکر کے لیے عذابِ جہنم اور اللہ کی لعنت کی وعید سناتا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ عدل و قسط کو پسند فرماتا ہے اور اسی کا حکم دیتا ہے' عدل کے قیام کے لیے اپنے پیغمبروں کو مبعوث فرماتا ہے' ظلم و زیادتی کو ناپسند فرماتا ہے اور اس کو مٹانے کا حکم دیتا ہے۔ اللہ کے پیغمبر ظلم کو مٹانے کی جدوجہد اور محنت کرتے رہے۔اللہ تعالیٰ نے شرک کو سب سے بڑا ظلم قرار دیا ہے۔فرمایا: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ (لقمٰن) ''سب سے بڑا ظلم شرک ہے''۔دوسری جگہ فرمایا کہ شرک کرنے والا ہمیشہ جہنم کا ایندھن بنے گا: ﴿مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ﴾ (المآئدۃ: ۷۲) ''جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا تو

اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے''۔اس کے مقابل سب سے بڑا عدل توحید ہے اور جو توحید کا حامل ہوگا وہ لازماً جنت میں جائے گا:((مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ))(۳)۔اب مشرک اور موحد کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ اس لحاظ سے تو 'مساوات' ظلم نہیں بلکہ ظلمِ عظیم کے مترادف ہے اور اسلام کی صفت 'عدل' کے خلاف ہے۔

عدل کیا ہے؟ عدل کی سادہ سی تعریف یہی ہے کہ ''حق دار کا حق ادا کرنا''یعنی جس چیز کا جو حق ہے وہ اسے دینا 'عدل' کہلاتا ہے۔عدل کا مفہوم علماء بیان کرتے ہیں:اَلتَّسْوِيَةُ بَيْنَ الْمُتَمَاثِلَاتِ وَالتَّفْرِقَةُ بَيْنَ الْمُخْتَلِفَاتِ (ہم مثل چیزوں میں برابری قائم کرنا اور مختلف چیزوں کے درمیان تفریق کا رویہ اپنانا) اس تعریف کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی شے کا حق کیا ہے' یہ کیسے معلوم ہوگا؟ اس کا جواب ہے ''شریعتِ اسلامی''یعنی ''شریعتِ اسلامی''ہی عدل و توازن اور اعتدال کا نام ہے اور کفر اپنی تمام تر تشریحات میں ظلم' بے انصافی اور عدمِ اعتدال ہے۔اس اعتبار سے ظلم و بے انصافی' عدمِ اعتدال پر مبنی وہ فیصلہ و حکم ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم و فیصلہ اور شریعت سے مختلف ہو۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (المآئدة)

''اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی تو ظالم ہیں۔''

﴿وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾ (النسآء:۵۸)

''اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔''

عدل کے ساتھ فیصلہ کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت نبی کریم ﷺ کے اس فرمان سے ہوتی ہے جسے سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے:

((كِتَابُ اللّٰهِ' فِيْهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ' وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ' وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ' هُوَ الْفَصْلُ' لَيْسَ بِالْهَزْلِ' مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ' وَمَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَ' وَمَنْ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ))(۴)

''یہ اللہ کی کتاب ہے جس میں گذشتہ قوموں کے حالات ہیں اور آنے والے واقعات کی خبر ہے۔یہ کتاب تمہارے درمیان پیش آنے والے مسائل کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔یہ فیصلہ کرنے والی کتاب ہے کوئی مذاق نہیں۔جس نے اس بنا پر کوئی بات کہی تو سچ بولا' جس نے اس پر عمل کیا تو وہ اجر کا مستحق ہوگیا اور جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا تو اس نے عدل کیا۔''

اسلام 'دینِ عدل' ہے' بندہ ہونے کے ناطے مرد اور عورت برابر ہیں کہ نماز کی ادائیگی اور روزہ رکھنا دونوں پر فرض ہے' لیکن صنفی اعتبار سے مختلف ہیں کہ عورت کے لیے حیض کے دنوں میں نماز معاف اور روزہ قضا کر دیا گیا۔ وراثت کا حق دار دونوں کو قرار دیا گیا لیکن ذمہ داریوں میں فرق کی وجہ سے حق میں تفریق کر دی گئی۔ معاشی سرگرمیوں کی اجازت دونوں کے لیے ہے لیکن فریضہ مردوں کا قرار پایا۔ جہاد میں شرکت کی اجازت دونوں کے لیے ہے لیکن فرض مردوں پر ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے گورا اور کالا' عربی و عجمی' امیر و غریب پیدا کیا اور اس بنیاد پر تفریق کو حرام قرار دیا۔ مگر انسان کی روحوں سے 'عہدِ الست' لے کر توحید کی تعلیم دی' پھر انہیں فطرتِ سلیم پر پیدا کیا' پھر آسمانوں سے وحی کا نور نازل کیا۔ اب کچھ لوگوں نے وحی کے نورِ فطرت پر لبیک کہا اور اللہ کے فرماں بردار مؤمن بن گئے اور دوسرے لوگوں نے نہ صرف نورِ وحی کا کفر کیا بلکہ نورِ فطرت کو بھی مسخ کرنے پر تُلے رہے' اللہ کے باغی و سرکش بن کر زندگی بسر کی تو وہ کافر کہلائے۔ دونوں کے حقوق و فرائض برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟ دونوں مساوی کیسے ہو سکتے ہیں؟ ایک اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز ہوا اور دوسرا اسفل السافلین میں جا گرا (جانوروں سے بھی بدتر درجہ میں!) یوں اسلام تمام 'ادیانِ عالم' یعنی زندگی گزارنے کے مختلف طریقوں کو برابر حیثیت دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں بلکہ اللہ کے دین کو ''الحق'' اور باقی تمام ادیان کو باطل قرار دیتا ہے اور انبیاء و رسل کو حق کے غالب کرنے اور باطل کے مٹانے کے لیے مبعوث کرتا ہے۔

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (الصف:۹)

''وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے۔''

حواشی

(۱) صحیح مسلم' کتاب المساجد' باب من احق بالامامۃ۔

(۲) سنن الترمذی' کتاب البر' باب ما جاء فی رحمۃ الصبیان۔

(۳) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب من خص بالعلم قوما دون قوم کراھیۃ ان لا یفھموا۔

(۴) سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی فضل القرآن۔

❁❁❁

خصوصی اشاعت پر تہنیتی مکاتیب

(۱)

"میثاق" پاک و ہند کے اردو جرائد میں ممتاز مقام رکھتا ہے

محترمی و مکرمی ——— السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کا خط ملا۔ تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

سب سے پہلے ماہنامہ "میثاق" کی گولڈن جوبلی اشاعت پر مبارک باد قبول فرمائیں۔

الحمدللہ! ماہنامہ میثاق گزشتہ دس برسوں سے زیر مطالعہ ہے۔ اس باوقار مجلّہ کے مشمولات ی، فکری اور عملی لحاظ سے ہمیشہ اپنے قاری کو ماضی تا حال مربوط کرتے رہے ہیں۔ محترم اکٹر اسرار احمد صاحب کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ انہوں نے ایک خاص نہج پر اسے تا حال قائم رکھا ہے اور اپنے تحریکی مشن میں اس مجلّہ کو بھی اپنے قاری کے لیے قرآن وسنت کی صحیح اسپرٹ میں روی کے لیے وسیلہ بنایا ہے۔ بالخصوص اس میں بیان القرآن اور سیرت کے مختلف النوع لوؤں پر علمی وفکری مضامین کا سلسلہ اسے ہندوپاک کے اردو رسائل وجرائد میں ممتاز مقام طا کرتا ہے۔ اس مجلّہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس سے علماء اور دانشوروں کا طبقہ ہی یں بلکہ عام پڑھے لکھے قارئین کو بھی استفادے میں دشواری نہیں ہوتی۔ معاشرتی اُمور پر سلام کے رہنما خطوط پر مبنی مضامین بھی اس کی وقعت میں نہ صرف اضافہ کرتے ہیں بلکہ دینی بیت کا بہترین سامان فراہم کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری دعا یہی ہے کہ اس کی اشاعت جاری رہے اور اُمت مسلمہ کے افراد اس سے بھرپور مستفیض ہوں۔

خاکسار محمد عارف اقبال

مدیر ماہنامہ اردو بک ریویو، نئی دہلی، انڈیا

(۲)

خصوصی اشاعت قابل تعریف‘ بے حد پسندیدہ اور معلوماتی ہے

محترم جناب مدیر ماہنامہ ’’میثاق‘‘ لاہور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں آپ کو اور سب ساتھیوں کو اس بات پر تہہ دل سے مبارک باد دینا چاہتا ہوں کہ نومبر ۲۰۰۹ء میں شائع ہونے والی میثاق کی خصوصی اشاعت نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ بے حد پسندیدہ اور معلوماتی بھی۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ سے دعا ہے کہ اس کی روز افزوں ترقی میں خوب اضافہ ہو‘ آمین۔ اسی رسالے میں جناب محمد بشیر صاحب کا مضمون ’’اسلامی مدارس میں عربی کی تعلیم۔ خشت اوّل درست کرنے کی ضرورت‘‘ میرے خیال سے یہ مضمون ہمارے دینی مدارس اور بالخصوص اقامتی اداروں کے لیے دیر آید درست آید کے مصداق بہت ہی مناسب‘ بے خد موزوں اور بروقت رہنمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے وہ ہمارے تمام ایسے اداروں کے چلانے والے بزرگوں کو اس طرف متوجہ فرمائے۔ آمین!

محمد عبداللہ شاہ صدیقی
گرین لین‘ سیون کنگز‘ انگلینڈ‘ یو۔ کے

(۳)

’’میثاق‘‘ کی خصوصی اشاعت ایک بہت بڑی علمی خدمت ہے

مکرم ومحترم ایڈیٹر صاحب ماہنامہ ’’میثاق‘‘ لاہور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے آپ کے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

ماہنامہ میثاق کی اشاعت خاص پر دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔ آپ نے یہ خصوصی اشاعت شائع کر کے ایک بہت بڑی علمی خدمت انجام دی ہے۔ اس خصوصی اشاعت کے مضامین بڑے علمی‘ جامع اور معلوماتی ہیں۔ خاص طور پر مولانا اصلاحی مرحوم کا مضمون: ’’میثاق

کا اجراء کیوں؟''۔ محترم ڈاکٹر صاحب کا انٹرویو' مولانا عبدالغفار حسن کا مضمون: جہاد کی اعلیٰ قسم' انجینئر نوید احمد صاحب کا مضمون: حرمت ناموسِ رسالت' پروفیسر محمد یونس جنجوعہ کا مضمون: اصحابِ رسول کی استقامت اور پروفیسر عبدالعظیم جانباز کا مضمون: ''سرمایہ دارانہ نظام اور اسلام'' اس اشاعت خاص کا جوہر اور عطر ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کی دینی و علمی خدمات کو قبول کرے اور آپ کے علم و عمر میں برکت عطا فرمائے۔

مخلص' عبدالرشید عراقی

سوہدرہ' ضلع گوجرانوالہ

بقیہ: قتال فی سبیل اللہ......

(۶) مصدّقہ اطلاعات کے مطابق اگر کوئی دشمن مسلمانوں کے خلاف جارحیت کی تیاری کر رہا ہو تو اُس کے خلاف بھی اگر ممکن ہو تو اقدام لازم ہے۔ غزوۂ تبوک کے لیے سفر کا سبب یہ اطلاعات بنی تھیں کہ قیصرِ روم مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی کی تیاریاں کر رہا ہے۔

(۷) اپنے دائرۂ اقتدار میں اسلام کے عادلانہ نظام کے غلبہ و استحکام کے بعد اپنی اہلیت و صلاحیت کے مطابق اُس کی توسیع کے لیے اقدام کرنا لازم ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۲۳﴾ (التوبة)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جنگ کرو اُن سے جو تم سے ملحق ہیں کفار میں سے اور وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔ اور جان لو بے شک اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے۔''

ماہنامہ میثاق کے زرتعاون میں اضافہ

قارئین کرام اور ایجنسی ہولڈرز نوٹ فرمالیں کہ ماہِ رواں سے میثاق کے اندرون ملک زرتعاون میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ نظر ثانی شدہ زرتعاون درج ذیل ہے:

قیمت فی پرچہ	25 روپے
سالانہ زرتعاون	250 روپے (25 فیصد رعایت)
برائے ایجنسی (5 شمارے) فی پرچہ	15 روپے (40 فیصد رعایت)

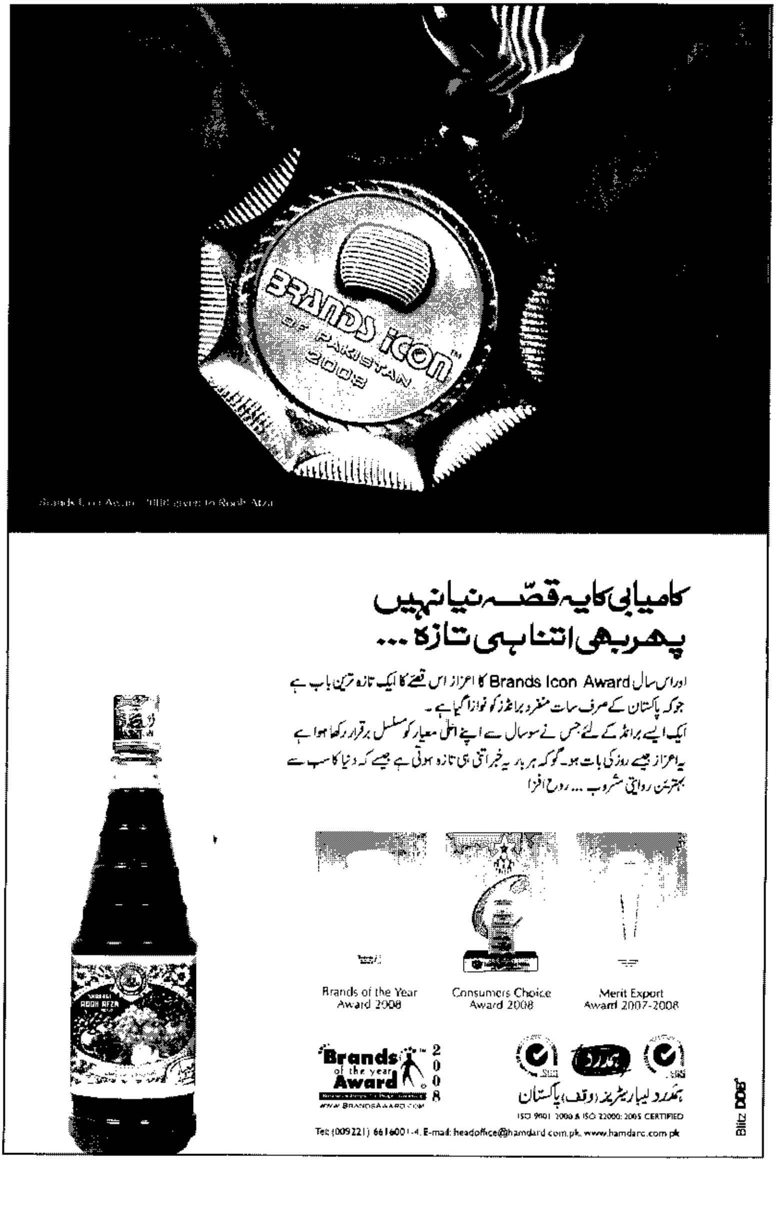

BRANDS ICON OF PAKISTAN 2008
کامیابی کا یہ قصّہ نیا نہیں
پھر بھی اتنا ہی تازہ ...
اور اس سال Brands Icon Award کا اعزاز اس قصّے کا ایک تازہ ترین باب ہے
جو کہ پاکستان کے صرف سات منفرد برانڈز کو نوازا گیا ہے۔
ایک ایسے برانڈ کے لئے جس نے سو سال سے اپنے اعلیٰ معیار کو مسلسل برقرار رکھا ہوا ہے
یہ اعزاز جیسے روز کی بات ہو۔ گو کہ ہر بار یہ خبر اتنی ہی تازہ ہوتی ہے جیسے کہ دنیا کا سب سے
بہترین روایتی مشروب ... روح افزا
Brands of the Year Award 2008
Consumers Choice Award 2008
Merit Export Award 2007-2008
Brands of the year Award 2008
WWW.BRANDSAWARD.COM
ہمدرد لیبارٹریز (وقف) پاکستان
ISO 9001: 2000 & ISO 22000: 2005 CERTIFIED
Tel: (009221) 6616001-4. E-mail: headoffice@hamdard.com.pk, www.hamdard.com.pk
Blitz DDB